تصوف

"ہر عِلم کا مَغز تَصَوُّف ہے۔ اَللّٰہ تَعالٰی (جَل شانہٗ) اور اُس کے رَسُول کریم (ﷺ) کی باتیں اُم الْعُلوم اور احیاءُ العُلوم ہیں۔ عِلمِ تَصَوُّف سے حقّ و باطِل میں تَمیز ہوتی ہے۔ جو شخص عِلمِ تَصَوُّف نہیں پڑھتا' اس کا دِل سِیاہ رہتا ہے' اور ہمیشہ جہل و نِفاق میں رہتا ہے۔ عِلمِ تصوّف ہی عِلمِ فَقر اور سِلکِ سلُوکِ فَقر ہے۔ اس سے قَلبی تَصدیق' تَوفیق بَحقِ رَفیق بَتحقِیق فَضلِ اللّٰہ حاصل ہوتے ہیں۔ عِلمِ تَصَوُّف سے عَارف رحمتِ الٰہی بن جاتا ہے۔ جو شخص عِلمِ تَصَوُّف سے منع کرتا ہے' وہ بے دِین ہے"۔

سُلطان الْفَقر حضرت سُلطان بَاھُوؒ قدس اللّٰہ سِرّہٗ

(اَلمِیرُ الکَونین۔ ص ۹۳)

www.yabahu.com

"۔۔۔۔۔ خُدا کے بھید سب سے جُدا ہیں۔ جیسا وہ ہے ایسے ہی اُس کے بھید ہیں۔ نہ اُس کی کوئی انتہا ہے۔ نہ اُس کے بھیدوں کی کوئی انتہا ہے۔ جب سے دنیا آباد ہوئی ہے اُس کے بھیدوں کا آج تک پتہ نہ چلا اور ہر ایک پر ایک نیا ہی معاملہ گزرتا رہا اور نیا ہی دِکھاتا ہے۔ دیکھو! آپ دس شخصوں کو جمع کیجئے اور ہر ایک اپنا اپنا خواب بیان کرے۔ دسوں کے خواب دس طرح کے ہوں گے۔ کسی کا ایک دوسرے سے ملتا ہوا نہ ہو گا۔ گو ایک ہی معاملہ کی تشریح دکھائی جاوے لیکن جُدا ہی رنگ ہو گا۔ اس کی اُونچ نیچ معاملہ کو دیکھ کر ہی سمجھی جاتی ہے۔

کتاب نطاب (غیر مطبوعہ)

حضرت حاجی عبداللہ شاہ "باھوشاہ غوث و قطب"

فرمایا :

فقر کی راہ کے لئے بہت بڑا دِل چاہیے۔ ہمّت کے ساتھ ہی یہ راستہ طے ہو سکتا ہے۔ آدمی اپنی جان کو جان نہ سمجھے اور کوشش میں لگا رہے تو آخر ایک دن منزل پا ہی لیتا ہے۔

ملفوظات (غیر مطبوعہ)

قطب العالم حضرت سید محمد وارث حسین شاہ

فہرست

مقدمہ — صاحبزادہ عبدالرسول ۱

پیش لفظ — سید احمد سعید حمدانی ۱۵

عصر جدید اور مسائل تصوف

مغرب میں رُجحان کی تبدیلی ۱۸

اہلِ مغرب کی موجودہ ہترِیت پسندی ۲۱

مشرق کی اثر پذیری ۲۳

تصوّف سے بدظنی کے اسباب ۲۶

تصوّف کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ۳۰

قابلِ غور مسائل ۳۱

ترتیب ۳۴

ہترِیت (مِسٹِسزم)

ہترِیت اور تصوّف ۳۶

ہترِیت اور تصوّف میں وجہِ اشتراک و اختلاف ۳۷

صُوفیانہ اور ہتری تجربات و اصول کے مشترکہ خصائص ۳۸

ہترِیت (مِسٹِسزم) کے خصائص ۴۲

وِجدان ۴۳

جبلّت اور وِجدان کی کارکردگی ۴۴

وِجدان اور عقل ۴۵

www.yabahu.com

عقل کا دائرۂ کار ۴۶
سرّیت اور فلسفہ ۴۷
سرّیت اور مذہب ۴۹
سرّی سلوک کی حدود و قیود ۵۳
سرّیت کا اثر ۵۴
صُوفی اور سرّیت پسند سالک ۵۷

تصوف

تَصَوُّف: مخصوص اِسلامی اصطلاح ۵۸
باطن کی اوّلیت و اہمیّت ۵۸
مآخذ ۵۹
محض تزکیہء نفس نہیں ۶۱
محض دینی نفسیات بھی نہیں ۶۳
حکمتِ الٰہیہ ۶۳
رُوحانی تجربات ۶۵
رُوحانی تجربات کا تنوّع ۶۷
رُوحانی تجربات اور مختلف طریقے ۶۹
عصرِ جدید میں سلوک میں ترمیم کی ضرورت ۷۲
جدید دور میں مشائخ کا طرزِ عمل ۷۳
رُوحانی شعور ۷۵
بیعت و صُحبتِ شیخ ۸۰
فنا و بقا ۸۳
علم و معرفت کی خصوصیت ۸۹

عشق و محبّت ۹۱
محبّت اور اِطاعت ۹۲
ناکام صُوفی ۹۳
مَردانِ حق اور تفویض کار ۹۳
مناصب ۹۶
زبان و بیان ۹۹
خانقاہ ۱۰۱

تاریخ کا ظاہری عمل اور تصوف

پُرجوش تخلیقی عمل ۱۰۳
آثارِ قلم کی بجائے آثارِ قدم ۱۰۵
مُعلّم و مُربّی ۱۰۷
معاشرے کے ضمیر کی آواز ۱۰۷
صُوفیاء پر ہی اعتراض کیوں؟ ۱۰۸
تاریخی شہادت ۱۰۹

حواشی ۱۱۳
کتابیات ۱۱۸

www.yabahu.com

"تصوّف وہ علم ہے' جس سے تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ اخلاق اور ظاہر و باطن کے احوال پہچانے جاتے ہیں۔ تاکہ سعادتِ ابدی حاصل ہو۔ نفس کی اصلاح ہو اور ربّ العٰلمین (جل شانہ) کی رضا اور اس کی معرفت حاصل ہو۔ اور تصوّف کا موضوع تزکیہ' تصفیہ اور تعمیرِ باطن ہے اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے"۔

(دلائل السلوک۔ ص ۱۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

تصوّف کے بارے میں ہر دور میں آرا کا اختلاف رہا ہے اور اس کی حقیقت سمجھنے میں عام آدمی کو دشواریوں کا سامنا رہا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق قیل و قال سے نہیں بلکہ اس کا ادراک خالصتاً" قلبی واردات اور حال سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک صاحب علم جو پوری طرح قوت اظہار سے متصف ہو' استدلال کی فراوانی کے ساتھ بھی تصوف کو سمجھانے کی کوشش کرے تو اس صورت میں بھی یہ ضروری نہیں کہ سننے والے پر تصوف کے اسرار و رموز پوری طرح منکشف ہو جائیں یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ایک فرد خود تجربہ و شہود کی منزل سے گزار ہو۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ خود اس راستے کا سالک محض علمی اصطلاحات کے ذریعے ایک عام آدمی کے ذہن تک اپنے تجربات و واردات کو پہنچا سکے۔ اس کے لئے بہر صورت اس راستہ کا سفر از بس ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ تصوف ہمیشہ ان لوگوں کے مابین ما بہ النزاع رہا جو اس کے "مالہ' و ما علیہ" سے نابلد تھے۔

گذشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس نے ان مسائل کو مزید الجھا دیا۔ اس سے مراد مغربی افکار کی وہ یلغار ہے جو مستشرقین کے ذریعے عالم اسلام پر ہوئی۔ مسلم ممالک میں سیاسی زوال کے ساتھ فکری و علمی

www.yabahu.com

تحقیق کے سوتے بھی خشک ہوتے گئے۔ اور مسلم قوم تحقیقی میدان میں بھی اہل مغرب کی دست نگر بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے مسائل سمجھنے کے لئے بھی مستشرقین کی تحریریں سند مانی جانے لگیں۔ اس صورت حال سے ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا بر وقت تدارک نہ ہو سکا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے قومی شعور کا حصہ بن گئیں۔

ایسی ہی غلط فہمیوں میں ایک خود تصوف کی تعریف اور اس کا صحیح تصور ہے مغرب میں پہلے سے ایک لفظ Mysticism مروج تھا چنانچہ اسلامی تصوف کا ترجمہ کرتے وقت اس لفظ کو (جسے زیر نظر کتاب میں "سریت" کہا گیا ہے) استعمال کیا گیا۔ اس ترجمہ کے بعد سریت کا جو مفہوم مغرب میں معروف تھا وہ از خود تصوف سے منسوب کر لیا گیا۔ پھر جب اہل مغرب کی تحریریں، مشرق میں پہنچی تو تصوف اپنا اصلی مفہوم کھا بیٹھا اور اسے وہی معانی پہنائے جانے لگے جو سریت سے مختص تھے۔ آج اسلامی تصوف پر جو اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو بالعموم ان کے پیچھے یہی غلط فہمی کار فرما نظر آئے گی۔

دور حاضر میں جہاں عالم اسلام مغرب کے سیاسی تسلط سے آزاد ہونے لگا۔ وہاں اس کے ذہن نے غلامی کی ردا بھی اتار پھینکی۔ اہل فکر و نظر نے اپنی علمی کاوشوں میں عینک اتار دی جو انہوں نے مغرب سے مستعار لے رکھی تھی۔ یوں ان کی علمی تحقیقات سے حقائق بے نقاب ہونے لگے۔ اس پس منظر میں اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ کہ تصوف کی حقیقت پر بھی تحقیق کی جائے اور اس کے اصل مفہوم کو واضح کیا جائے۔ لیکن یہ کام کوئی ایسا صاحب دل ہی کر سکتا تھا جو خود بھی اس راہ کے نشیب و فراز سے شناسا ہو اور تصوف اس کے لئے محض علمی اصطلاح کے بجائے ایک ذاتی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

پروفیسر سید احمد سعید ہمدانی اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے کی کما حقہ صلاحیت رکھتے ہیں ان کا تعلق موضع کھٹکہ (وادی سون) ضلع خوشاب کے ہمدانی

سادات سے ہے۔ اور آج کل اپنے ہی علاقہ کے گورنمنٹ کالج نوشہرہ کے پرنسپل کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں، یوں تو پروفیسر ہمدانی صاحب کی طبیعت میں علمی تحقیق کا شوق شروع سے موجود تھا لیکن اس میں خاص موڑ اس وقت آیا جب وہ خود ایک صاحب ارشاد کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اور بیکار ساحل رہنے کے بجائے تصوف کے بحر ذخائر کی شناوری اختیار کی۔ اب تصوف ان کا خاص موضوع بن گیا۔ جس پر انہوں نے بہت کچھ پڑھا۔ سوچا اور تجربہ کیا۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد انہوں نے اس پر قلم اٹھایا۔

زیر نظر کتاب سے پہلے پروفیسر ہمدانی صاحب کی متعدد تحریریں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں "تذکرہ غوث و قطب" اس لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے مرشد کے حالات زندگی قلمبند کئے ہیں۔ یوں بالواسطہ طور پر مصنف کی تربیت گاہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ "احوال و مقامات حضرت سلطان باھُوؒ" حضرت سلطان العارفین قدس اللہ سرہ، کے حالات و افکار پر تحقیقی کتاب ہے۔ مصنف نے اس تحریر میں حضرت سلطان باھو قدس اللہ سرہ، کے حوالہ سے تصوف سے متعلق بعض اہم موضوعات پر بحث کی ہے۔

المغرب کے مشہور ولی اللہ سید ابو الحسن شاذلی رحمتہ اللہ علیہ کی دعا "حزب البحر" کا ترجمہ بمع شرح بھی انہوں نے شائع کیا ہے جو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے افاضات پر مشتمل ہے۔

"عصر جدید اور مسائل تصوف" مصنف کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ اس میں مغرب میں مادہ پرستی کے خلاف موجودہ رد عمل اور وہاں سریت پسندی کے رجحانات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، ساتھ ہی سریت کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی خوبی سے سریت اور اسلامی تصوف کا تقابل پیش کیا ہے۔ اور ان میں اشتراک و اختلاف کی ایسی عمدہ نشان دہی کی ہے کہ ہمارے ہاں بعض علمی حلقوں میں اسلامی تصوف کو سمجھنے میں جو دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ اب دور ہو جائی

www.yabahu.com

چاہیے۔

کتاب کے آخری حصہ میں مصنف نے اسلامی تصوف، کی مخصوص اصطلاحات سلوک کے مقامات اور اکتساب فیض کے طریق کار کو مختصراً" مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ اور دور حاضر میں اس کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف ان لوگوں کے لئے مفید رہے گا جو علمی سطح پر اسلامی تصوف کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ جو تصوف کو اپنے لئے تزکیہ نفس کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

— ☆ ☆ ☆ —

صاحبزادہ عبدالرسول

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء

(پرنسپل) گورنمنٹ کالج سرگودھا

www.yabahu.com

الحمد للہ رب العلمین ○ الرحمن الرحیم ○ والشمس وضحھا ○ والقمر اذا تلھا ○ والنھار اذا جلھا ○ واللیل اذا یغشھا ○ والسماء ومابنھا ○ والارض و ما طحھا ونفس وما سوھا ○ فالھمھا فجورھا و تقوھا ○ قد افلح من ذکھا ○ و قد خاب من دسھا ○ (قرآن مجید۔ ۹۱ : ۱ ۔ ۱۰)

کسی کی بندگی نہیں سوا اللہ کے' محمد اللہ کے رسول ہیں۔

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا' بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔ قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ چڑھنے کی اور چاند کی جب اس کے پیچھے آوے۔ اور دن کی جب اس کو روشن کرے اور رات کی جب اس کو ڈھانپ لیوے اور آسمان کی اور جیسا اس کو بنایا اور زمین کی اور جیسا اس کو پھیلایا اور جی کی جیسا اس کو ٹھیک بنایا۔ پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ نکلنے کی۔ مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملایا۔

اللھم صلی علی سید نا محمد نور الانوار و سرالاسرار وسید الابرار و زین المرسلین والاخیار واکرم من اظلم علیہ اللیل واشرق علیہ النھار

(دلائل الخیرات)

اے اللہ رحمت نازل فرما ہمارے سردار محمد ﷺ پر جو سب انوار کے نور ہیں اور سب بھیدوں کے بھید' سب نیکو کاروں کے سردار اور نیکو کار پیغمبروں کی رونق ہیں اور ان سب لوگوں سے بزرگ تر ہیں جن پر رات اندھیری ہوئی اور ان پر دن چمکا ۔ ۔ ۔ اما بعد

پیش لفظ

تصوف اور سلوک پر بے شمار تذکرے موجود ہیں جن میں صوفیاء کے احوال و آثار، ملفوظات و کرامات اور افکار و نظریات کا احاطہ کیا گیا ہے اور اکثر کتابیں ایسے بزرگوں نے تصنیف کی ہیں جو خود تصوف میں اونچے مقام پر فائز تھے اور ان کی ہر بات تصوف کے موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو اس موضوع پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ تھی۔ مگر زیر نظر کتاب ایک مخصوص مقصد کے تحت اور ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس میں تصوف کے صرف ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو اس صدی کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں ابھرے اور دور جدید کی فکری میں نمایاں ہوئے۔ گو ان کی تفصیل اور سیاق و سباق میں تصوف کی ابتداء اس کے ماخذ، معاشرے میں اس کی اہمیت اور صوفیاء کرام کے مقامات کے بارے میں بھی ذکر موجود ہے مگر اسے صرف اسی حد تک طول دیا گیا ہے جس حد تک موضوع سے متعلق شرح و تبصرہ کے لئے ضروری تھا۔ جہاں تک اس فقیر کو علم ہے اس دور میں اس موضوع پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ عصر جدید میں تصوف اور اس کے مسائل کے بارے میں اس تحقیقی جائزہ کی نوعیت کو دیکھا جائے تو اس فقیر نے بصد عجز و انکسار اس دور کے صوفیاء و مشائخ کرام کی خدمت کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ خدمت خلق طالبان حق کی راہنمائی اور عبادات میں انہماک کی بنا پر حضرات مشائخ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ خود اس صورت حال کا بغور تجزیہ جائزہ لے سکیں۔ اس لئے ان کی سہولت و اطلاع کے لئے تصوف کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنی رویہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور اپنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات کا بھی مختصراً ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ اس طبقہ کے لوگ جب ان کی خدمت میں حاضر ہوں تو اس بیان کی روشنی میں وہ ان کے ذہنی پس منظر کے پیش نظر ان کی راہنمائی کے لئے صحیح لائحہ عمل تجویز کر سکیں۔

دینی علوم میں یہ تشکیک و تلبیس کا دور ہے کبھی حقیقت شک کی نذر ہو جاتی ہے اور کبھی حق و باطل یوں گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ حق کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ تصوف کے بارے میں بھی اس تشکیک و تلبیس نے ذہنوں کو غلجان اور بد عقیدگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے تصوف کی حقیقت و اہمیت کے جاننے اور سمجھنے میں مانع ہیں۔ اگر کوئی پڑھنے والا اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تصوف پر لکھی ہوئی کسی بزرگ کی مستند کتاب کے مطالعہ کی طرف رجوع کرتا ہے یا کسی ولی کی طرف مائل ہوتا ہے تو فقیر اسے اپنے لئے سعادت خیال کرے گا۔ کیونکہ اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

واللّٰہ الموفق والمستعان والحمد للّٰہ رب العلمین و صلی اللّٰہ علیٰ مُحمّد خاتم النبیین و عترتہ الطاھرین۔

سید احمد سعید بمصطفی

www.yabahir.com

عصرِ جدید اور مسائلِ تصوف

ظاہر کے جلال سے اُکتا کر، گھبرا کر اور بھنّا کر دنیا ایک بار پھر باطن کے حُسن و جمال کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔

مشرق میں تو ابھی تک دائرہ مکمل نہیں ہوا۔ مگر مغرب میں مادیت اور ظاہر پرستی کا دائرہ مکمل ہو چکا ہے۔ اب وہ دوسرے دائرے میں جست لگانے والے ہیں اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو یہ دائرہ سریت، تصوف اور روحانیت کا دائرہ ہو گا۔

آج سے تین چار سو سال پہلے اہل مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے لئے جو مساعی شروع کی تھیں۔ ان کا اب نقطۂ عروج آ چکا ہے۔ اب وہ ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے وہ کسی دوسرے رخ پر اپنا سفر شروع کریں گے اور اب تک جو آثار ظاہر ہوئے ہیں۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رخ اب باطن کی جانب ہے۔

مغرب میں رُجحان کی تبدیلی :۔

سائنس نے اپنے دورِ کمالات میں دنیا بھر کو لا تعداد سہولتیں بہم پہنچائیں۔ روزانہ کی زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ فاصلے سمٹ گئے۔ وقت سکڑ گیا اور قوت و محنت کا کام مشینیں کرنے لگیں۔ عجائبات کی طرف دیکھئے۔ تو یہ بھی کوئی کم عجوبہ نہ تھا۔ کہ انسان چاند تک جا پہنچا۔ اور وہاں سے زمین کو چاند کی شکل میں دیکھنے لگا۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور خلائی جہاز مریخ اور دوسرے کروں کی سیر کر رہے

ہیں اور ان کی خود کار مشینیں تصویروں کی شکل میں معلومات ارسال کر رہی ہیں۔ ان تمام کمالات کے ساتھ انسانی اذہان میں انقلاب برپا ہوا۔ قاعدے، قانون، قدریں اور رسوم سب متاثر ہوئیں اور ذہنی افق بدل گئے۔ اب تک لوگ کوشش کرتے رہے تھے کہ ان نئی ایجادات و معلومات کے ساتھ کسی نہ کسی طرح موافقت کرتے ہوئے دن گذارتے چلے جائیں اور ظاہر کی ان نئی تبدیلیوں کے ساتھ موجودہ ظاہری نظام کو ہی درست رکھیں کہ ان کے ہاں بادی الرائے میں ظاہر ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے آگے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مگر اب سائنس اور ٹیکنالوجی نے معاملہ وہاں تک پہنچا دیا ہے کہ اس سوچ کو بدلنا پڑ رہا ہے اور اس سوچ کی حدود لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی ہیں۔

یونہی سرسری طور پر بھی اگر دنیا کی موجودہ حالت پر نگاہ ڈالی جائے۔ تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ اس پورے کُرۂ ارض کی جاندار مخلوق تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اس قسم کے خود کار ہتھیار بن چکے ہیں کہ سینکڑوں میل کے فاصلے پر آبادیوں کو تباہ کر سکتے۔ کچھ سال پہلے امریکہ کی سینٹ کا ایک رکن روس گیا تو ملاقات پر روس کے اس وقت کے وزیر اعظم نے اسے روسی ہتھیاروں کی ہلاکت خیزیوں سے مطلع کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں یہاں سے ایک بٹن دباؤں گا اور نیویارک میں تم لوگوں کے پرزے اڑ جائیں گے۔ لیکن یہ صرف یک طرفہ اظہار حال و خیال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں طرف سے فوجیں جدید ترین مہلک ہتھیاروں سے لیس اور حکم کی منتظر کھڑی رہتی ہیں۔ روس اور امریکہ کے علاوہ دوسرے کئی ملکوں کے پاس بھی ایسے ہی ہتھیار موجود ہیں اور اب تو یہ بات لطیفہ کی بجائے ایک تلخ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ روس اور امریکہ کے سربراہوں میں سے اگر کسی کا دماغ پانچ منٹ کے لئے خراب ہو جائے تو یہ پوری دنیا تباہی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں کرہ ارض کے اس حصے میں رہنے والوں کی ذہنی کیفیت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ وہ جنہیں آسائش و رہائش کی ایسی سہولتیں میسر ہیں کہ پہلے زمانے کے جلیل

www.yabahu.com

القدر بادشاہوں کو بھی میسر نہ تھیں' اب رات دن جنگ اور موت کے خوف میں مبتلا ہیں اور تمام ظاہری شان و شوکت کے ہوتے ہوئے دنیا اور اس کی زندگی انہیں بے معنی نظر آتی ہے۔

ظاہر میں جو مفہوم ہو سکتا تھا' وہ تو یہی تھا جس کا ظہور ہو چکا اور باطن سے اب تک یہ لوگ غافل رہے ہیں۔ اگر باطن پر انہوں نے نظر ڈالی بھی سہی تو اسے ظاہر کی عینک سے ہی دیکھا یعنی تصوف کی اصطلاح میں نفس سے آگے نہ جا سکے۔ چنانچہ نفسیات کے بارے میں جو کچھ نئی باتیں دریافت ہوئیں۔ ان کی حیثیت نفسیاتی الجھنوں سے زیادہ نہیں۔ ان سے پیچیدگیوں میں اضافہ ہی ہوا۔ ان سے زندگی کی مشکلات کا حل تو نہ مل سکا۔

اس پورے عرصہ میں سائنس نے ظاہر سے سروکار رکھا اور باطن کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ایک قسم کی مخاصمت کا رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل میں ظاہر پرستی اپنے نقطۂ عروج کو چھونے لگی تھی۔ اور مافوق الطبیعات اور خاص طور پر سریت اور تصوف کے خلاف رد عمل اپنی انتہاء کو پہنچ چکا تھا حتیٰ کہ مذہب کے اوامر و نواہی کو بھی جو خواہر سے تعلق رکھتے ہیں اضافی حیثیت دی گئی یا بیکار سمجھا گیا۔ در اصل وہ تمام علوم جن کا تعلق باطن سے ہے' نظر انداز کر دیئے گئے۔ طبیعاتی سائنس کے تجربات اور اسکے نتائج ہی علم کی بنیاد قرار دیئے گئے اور اس رجحان کو خرد افروزی کا خوبصورت نام عطا ہوا۔

یہ درست ہے کہ اس پوری مدت میں مذہب کا وجود برقرار رہا گو اس کے متعلق نہ صرف بد عقیدگی پیدا ہوئی بلکہ اس کے محرکات بھی ظاہر میں تلاش کرنے کی کوششیں ہوئیں جن سے ایمان متزلزل ہو گئے۔

اس دوران میں دنیا بھر کے سریت پسند اور صوفی جُوں تُوں کر کے اپنے اسالیب اور طرق سے وابستہ رہے تو یہ ان کی ہمت تھی۔ گو ان کے صومعے اور حجرے نیم ویراں ہو گئے۔ اور عوام ان کے طور و طریق سے برگشتہ ہو گئے۔ کیونکہ

غالب رجحان دنیا بھر کے لوگوں کا مادیت اور خواہر کی طرف ہی رہا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دنیا میں کوئی ایسا معاشرہ نہ رہا اور کوئی ایسی جماعت نہ رہی جس کی ثقافت جدید دور کی ظاہر پرستی کے اس رجحان کی دستبرد سے بچ گئی ہو۔

مگر اب جب کہ اہل مغرب کو سائنس کے کمالات نے اس درجے تک پہنچا دیا کہ وہ اپنی ہی بنائی ہوئی مشینوں سے خوف کھانے لگے اور دو شدید مہلک جنگوں سے دو چار ہو کر انہوں نے ان کی تباہ کاریوں کو دیکھ لیا۔ تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ اب تک جو محض ظاہر اور ظاہر کے کمال پر وہ بھروسہ کرتے آئے تھے۔ ناکافی ہے بلکہ اسی بھروسے کو لے کر وہ اگر مزید آگے بڑھے تو ہلاکت اور موت کو منتظر پائیں گے۔

اہلِ مغرب کی مَوجودہ سریت پَسندی :-

ایک وقت تھا کہ لوگ سائنس دانوں کو مستقبل کے حکمران متصور کرنے لگے تھے۔ پھر جب ان سے مایوس ہوئے تو سیاست دانوں کو حب الوطنی اور دانائی کا اجارہ دار سمجھنے لگے۔ مگر بعد ہی ان کی ہوس اقتدار نے ان کے بھی پول کھول دیئے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ان ملکوں میں جہاں ظاہر کے یہ دانا آزمائے جا چکے ہیں لوگ پھر سری علوم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

مشرق کے وہ لوگ بھی جو کبھی یورپ اور امریکہ نہیں گئے۔ اہل مغرب کی اس بے چینی اور روحانی اضطراب کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہ جو مشرق وسطیٰ سے لے کر مشرق بعید تک کے شہروں اور قصبوں میں مغرب کی نئی نسل کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بال بڑھائے اور کبھی کبھی چرس پیتے گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس پریشانی' حیرانی اور اندر کی بے اطمینانی کے غماز ہیں۔ جو ان لوگوں کو نت نئے ملکوں میں کسی موزوں اور متوازن اسلوب زندگی کی تلاش میں لئے پھر رہی ہے۔

مغرب کی اس نئی نسل نے اپنے اپنے ملکوں میں مادیت اور اس کی ترقیوں کی

www.yabahu.com

انتہاء بھی دیکھی اور اس کے ساتھ مسلمہ اخلاقی اقدار کا حشر بھی دیکھ لیا۔ نری مادیت جب اپنی انتہا کو پہنچی ہے تو بجائے خود ایک ایسا مذہب بن گئی ہے جس کا کوئی آئین نہیں اور اگر اس کے کچھ اصول ہیں تو وہ ہیں حرص' ہوس' اقتدار' ظلم اور ہر قسم کی بدمعاشی و بدخصالی۔ اس صورت حال" سے گھبرا کر یہ نوجوان لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مادی نظام اور سائنسی تجربات اور ان پر مبنی علوم کا دائرہ مکمل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ نئے دائرے میں داخل ہو رہے ہیں' انہیں یقین ہے کہ نیا دائرہ جو کچھ بھی ہو گا اب ظاہر سے متعلق نہ ہو گا۔ بلکہ اس کا تعلق باطن سے ہو گا۔ مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ اس نسل کا اعتبار تمام موجودہ رسمی علوم سے اٹھ چکا ہے اور اگر وہ اپنے ہی تجربات پر انحصار کرتے ہوئے کسی نئے سری سلوک کا اپنے لئے انتخاب کریں گے تو اس کے لئے وقت درکار ہو گا۔ ابھی وہ اس لحاظ سے عبوری دور میں ہیں اور ان کے رجحان کا رخ واضح ہے' نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ سرعت پسندی اور باطن سے دلچسپی انہیں کہاں لے جائے گی!۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے سری سلوک کو اسلوب حیات کے طور پر اپنا لیں جس سے ظاہر کا توازن بھی برہم نہ ہو اور ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ اس عبوری دور کے اضطراب و انتشار پر ہی ٹھہر جائیں اور ان کا حشر بھی وہی ہو جو ایک پریشان خیال نشہ پرست قوم کا ہوتا ہے۔

نئی نسل کی اس سرگرانی اور سرگردانی کی جو سروے رپورٹیں یورپ اور امریکہ کے اخباری مجلّوں میں بھی چھپی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں تو ان اکتائے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں نے ایسے کیون (Communes) بنا رکھے ہیں جہاں وہ ہر قسم کی ظاہری پابندیوں سے بے نیاز مادر پدر آزاد زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بعض حالتوں میں انہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ خوش ہیں یا دکھی۔ کہیں ان لوگوں نے ہندو جوگیوں کی سی مشقیں کرنے کے لئے آشرم کھول رکھے

ہیں اور معمولی سی مشقوں اور منتروں کو ہی سب کچھ جانتے ہوئے ہندوستان نژاد پنڈتوں کے قدموں میں بیٹھنے کو ہی بڑی سعادت خیال کئے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ نفسیات کا ذوق رکھتے ہیں تو انہوں نے ذہنی نفسیات میں معلومات کے لئے فوق الحسی ادراک Extra Sensory Perception اور سری و باطنی تجربات میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہندوں اور بدھوں کے باقاعدہ سری سلوک اور مسلمانوں کے تصوف میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں اور ان میں سے اکثر ابھی تک اس حقیقت کی گہرائی تک نہیں پہنچے کہ گو مشرق کے ان بڑے مذاہب کے سری مسالک میں کچھ باتیں مشترک ہیں مگر ان میں نمایاں اور بین فرق بھی موجود ہے۔ خاص طور پر اسلام کے اندر تصوف کے اپنے مخصوص اوصاف ہیں جو اسے دوسرے مذاہب کے باطنی سلوک سے متمیز کرتے ہیں۔

مشرق کی اثر پذیری :۔

یہ ساری باتیں ہمارے لئے بہت اہم ہیں کیونکہ اہل مغرب کے اس روحانی اضطراب سے مشرق بھی زیادہ دیر تک بے بہرہ نہیں رہ سکتے۔ ایک سبب تو اس کا یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ مشرق میں ہم نے مغرب کے فلسفہ زندگی اور اس کے مخصوص میلانات کو بھی اپنا لیا تھا۔ اور اب جب کہ خود اہل مغرب اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں تو ظاہر ہے اس تبدیلی کا ہم پر بھی اثر ہونا لازمی ہے۔ پھر ہم میں تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو مغرب کے ہر رجحان اور ہر اسلوب کی بطور فیشن نقل کرنا چاہتا ہے خواہ اس میں کوئی معقولیت ہو یا نہ ہو۔ چند سال پہلے ہمارے یونیورسٹیوں میں فلسفے کے استاد منطقی اثباتیت اور وجودیت کا مطالعہ پر جوش انداز میں اپنے طالب علموں کو منتقل کیا کرتے تھے۔ اور آج وہی لوگ ایک نسل کو گمراہ کرنے کے بعد سری فلسفے کے مبلغ بنے ہوئے ہیں۔۔ کیونکہ مغرب میں غالب

www.yabahu.com

رجحان اب اسی جانب ہے۔ اسی طرح تو دو لیجے طبقے کی خام کاریاں ملاحظہ ہوں کہ ہمارے ہاں اس سے پہلے ملنگ اور مجاور کڑے اور منکوں کی مالائیں بھی پہنتے تھے اور تکیوں پہ یا کوچہ و بازار کے کونوں کھدروں میں بعض پریشان حال لوگ چرس بھی پی لیتے تھے۔ مگر معاشرے میں ان کو اکثر چشم حقارت دیکھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ مغرب کے ہپیوں (Hippies) کو دیکھ کر ہمارے ہاں مغرب پرست خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں نے کڑے پہننے شروع کر دیئے ہیں۔ اور بر سر عام چرس بھی پینے لگے ہیں۔ یہ فیشن پرست لوگ ہیں' اور بیشتر حالتوں میں ان کا مقصد محض ظاہر کی نقالی ہے۔ اگر ان کو درخور اعتنا نہ بھی سمجھا جائے تو کم از پڑھے لکھے لوگوں کی ذہنی اور علمی کیفیت کی طرف ضرور توجہ دینی پڑے گی کیونکہ پہلے معاملہ محض ظاہر کا تھا مگر اب بات باطن تک جا پہنچی ہے۔ ظاہر میں کہیں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اس کی تباہ کاریاں بھی کچھ کم ہلاکت خیز نہیں ہوتیں' لیکن باطن میں فساد پیدا ہو جائے تو من رہتا ہے نہ تن' قلب و روح بھی بگڑتے ہیں اور بحر و بر میں بھی فساد ظاہر ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے۔

سریت پسندی کے اس رجحان کے مقبول ہونے سے پہلے یہ سوچنا ہمارا فرض ہے کہ مغرب کی موجودہ سریت پسندی جس کے رجحان کا کوئی خاص رخ ابھی تک واضح ہو کر سامنے نہیں آیا جب ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کرے گی تو کیا اس سے ہمارے ذہنی انتشار میں اضافہ تو نہیں ہو گا؟۔ فی الحال معلوم یہی ہوتا ہے کہ اگر ہو بہو نقالی کی کوشش ہوئی اور سریت کے بارے میں ان کے کچے پکے نظریات دانشوروں کے فیشن میں داخل ہوئے یا صرف انہی کتابوں کے پڑھنے پر تکیہ کیا گیا جو سریت اور باطنی سلوک کے بارے میں یورپ اور امریکہ میں چھپ کر سامنے آ رہی ہیں تو لازماً" ذہن اور دماغ ایک نئے خلجان میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ایک اور مسئلہ قابل غور یہ ہے کہ مغرب میں تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں

بے پناہ ترقی کے ساتھ مادیت کا دائرہ تقریباً" مکمل ہو چکا ہے۔ ان کے ہاں اب ظاہر کی ترقی تو کسی نہ کسی طرح جاری رہے گی۔ صرف وہ باطن کے احوال کی طرف توجہ مبذول کر کے اپنا توازن درست کرنے کے متمنی ہیں۔ گو معاملہ نفس کی حد تک سہی مگر ان کے سائنس دانوں تک کو بھی اب باطنی ادراک اور سری تجربوں کی اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے۔(۱) لیکن ہمارے ہاں تو ابھی تک پہلا دائرہ ہی مکمل نہیں ہوا اگر یہاں توجہ کسی غیر متعین سری سلوک کی طرف ہی منعطف کر دی گئی تو اس امر کا خدشہ موجود ہے کہ ہم ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے رہیں گے۔ لہٰذا اہل مشرق کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو ایسے باطنی سلوک کی ضرورت ہے جو ان کی ظاہری ترقی کے مخالف نہ ہو اور یہ ان کے ہاں تصوف کی صورت میں پہلے سے موجود ہے صرف اس کی حقیقت پر روشن دماغی کے ساتھ نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام میں تصوف کا شعبہ سری سلوک کے اصول و قوانین اور قواعد و ہدایات فراہم کرتا ہے۔ راہبوں' بھکشوؤں' جوگیوں' سنیاسیوں کے سری سلوک اور ان کے دین و دنیا سے بیزاری سے دور طریقوں کے برعکس تصوف میں اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ اس کے عملی سلوک میں ظاہر و باطن کا توازن بگڑتا ہے نہ ظاہر کی ترقیات پر اس کا کوئی منفی اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے جدید دور کے جن محققین نے تصوف پر تحقیق کی ہے انہوں نے اس وصف کا برملا اظہار کیا ہے اور تصوف کے مطالعہ کے بعد کچھ اہل علم نے تو اسلام قبول بھی کر لیا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب کے سری سلوک میں توازن کو عمداً" یا کسی عقیدے کی رو سے ختم کیا گیا ہے۔ مگر اسلام کی بنیادیں ظاہر و باطن میں اس قدر مضبوط ہیں کہ اس کا خالص سری سلوک بھی ظاہر کو رد نہیں کرتا بلکہ باطن کو اہمیت اس لئے دیتا ہے کہ اس سے ظاہر درست ہو اور جب ظاہر درست ہو جاتا ہے تو ظاہر و باطن مل کر اخلاقی سیرت کی تعمیر اور ایمان و روحانیت کی تکمیل میں ممد معاون ہو جاتے ہیں۔

www.yabahu.com

ہمارے ہاں سریت پسندی کے رجحان کی تعمیری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ علمی سطح پر تصوف اور اس کے عملی سلوک کی از سر نو وضاحت کی جائے تاکہ پڑھے لکھے لوگ اسے سمجھ سکیں اور کسی ایسے سری سلوک کی جانب کشش محسوس نہ کریں جو محض فساد باطن کا سبب بنے اور اس سے دین و دنیا میں کسی کا بھلا نہ ہو۔

تصوّف سے بدظنی کے اسباب :۔

جیسا کہ ذکر ہوا کہ کچھ تو روح عصر سریت اور تصوف کے نظریات و عمل کے خلاف تھی کیونکہ سائنس کا دور دورہ تھا اور سائنسی تجربات نت نئے انکشافات کے ساتھ فطرت کی قوتوں کی تسخیر کا ذریعہ بن رہے تھے لہٰذا سری سالک میں دلچسپی سائنس میں انہماک کے لئے مضر خیال کی گئی اور کچھ یہ ہوا کہ مغرب میں مستشرقین نے جب مشرقی علوم اور خاص طور پر مشرقی مذاہب پر تحقیق شروع کی اور اپنے طور پر ان کی تشریح و توضیح میں مشغول ہوئے۔ تو انہوں نے بعض اوقات پہلے تو یہ تاثر دیا کہ تصوف کے اصل سرچشمے اسلام سے زیادہ عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے سری سلوک میں دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ تصوف اور ہر قسم کے سری سلوک میں کچھ باتیں ضرور مشترک ہیں۔ اس لئے پہلے سے تصوف کے برخلاف طبائع رکھنے والوں کو یہ باتیں قابل قبول نظر آئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغرب کے علماء محققین کا ہر بیان کردہ نکتہ حکمت و دانائی کا گہرا راز سمجھا جاتا تھا اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کو دہرانا علم کا کمال متصور ہوتا تھا۔ چنانچہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی تصوف کے بارے میں ظنون و شکوک میں مبتلا ہو گئے۔

تقریباً" ایک صدی کا عرصہ گذرتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تصوف اور اس کے عملی سلوک کو اسلام کی ہیئت اجتماعی اور اس کی ترقی کے لئے ضرر رساں خیال کرتا رہا ہے بظاہر اس کی فوری وجہ یہ بنی کہ مسلمان جب من حیث

القوم سیاسی سطح پر رو بہ زوال ہوئے تو انہوں نے اپنے زوال کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے تمام شعبوں اور اداروں کی کارگردگی اور ان کے اثرات و نتائج پر نظر ڈالی۔ اپنی انتہاء پسندی میں اکثر مصلحین نے ظاہر کی درستی پر اس قدر زور دیا کہ باطن اور روحانیت کے پہلو دب گئے۔ ان بزرگوں کو معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے' یہ یہ لوگ اپنے اپنے محاذوں پر آزادی اور قومی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے اور ایک لحاظ سے ہنگامی حالت میں یہ جنگ ان کے نزدیک سب سے بڑا فریضہ تھا۔ یہ اذکار و اوراد اور نوافل کا وقت نہ تھا' اس لئے وہ تصوف کو نظر انداز کرتے رہے بلکہ اپنے مقاصد کے پیش نظر کبھی کبھی انہوں نے اسے بے مصرف بھی قرار دیا۔ کچھ ایسا بھی نظر آتا ہے کہ کئی حضرات نے عمداً" اور ارادۃً" بھی تصوف کی اس طرح مخالفت کی کہ باطنی سلوک کے اداروں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے درپے ہو گئے۔ بدقسمتی سے خود مذہبی حلقوں میں شروع سے ایک طبقہ ایسا موجود رہا ہے جو تصوف اور طرق سلوک کا ہمیشہ مخالف رہا۔ ان مصلحین کو اس طبقے کی حمایت بھی حاصل ہوئی اور صورت حال ایسی پیدا ہوئی کہ تصوف کو ہر قسم کے اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا۔ جن میں سے بیشتر حتمی طور پر صریحاً" تعصب اور بغض کا نتیجہ تھے۔

اس امر کا تکرر بیان بے محل نہ ہو گا کہ ان مصلحین میں سے بعض معترضین قوم کے ہمدرد اور مخلص ضرور تھے۔ اور وہ تصوف سے اپنی لاتعلقی کو اس صورت حال میں اپنے لئے جائز سمجھتے تھے لیکن مخالفت کی رو میں ایسا ضرور ہوا کہ مخلصین اور غیر مخلصین تصوف کی مخالفت میں یکجا اور متفق ہو گئے اور تصوف کے متعلق بدظنی بڑھتی رہی اور اس کے بارے میں لغو اعتراضات بھی نہ صرف جائز بلکہ ثقہ اور سنجیدہ خیال کئے جانے لگے۔

تصوف کے خلاف بدظنی کو ہوا دینے میں رہی سہی کسر جدید دور کے متکلمین نے پوری کر دی۔ ایک تو ان میں سے بیشتر مصلحین کے گروہ سے ہی تعلق رکھتے تھے اور دوسرے یہ صوفیوں کے حلقوں میں کبھی بیٹھے تھے نہ انہیں صوفیوں کے

www.yabahu.com

احوال و تجربات اور ان کے اسالیب و طرق سے کوئی ہمدردی تھی۔ چنانچہ جہاں بھی تصوف کے حوالے سے مذہب پر کوئی اعتراض وارد ہوا' انہوں نے اس اعتراض کی نوعیت و اہمیت پر بات کرنے کی بجائے تصوف اور تصوف سے متعلق امور کو ہی رد کرنے میں سہولت محسوس کی۔ ان میں سے بعض مصلح و متکلم تو ایسی تجدد پسند طبائع رکھتے تھے کہ انہوں نے خانقاہوں کو تو ویسے ہی فضول سمجھا تھا۔ مسجدوں کے ساتھ بھی اپنے مقاصد اجتماعیہ کے لئے مساعی کا تعلق ختم کر لیا اور دفتروں اور لائبریریوں میں جا بیٹھے۔ جب کہ مسلمانوں میں عامتہ الناس کا اب بھی خانقاہوں اور مسجدوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کے اس رویہ کا اثر ان کی مساعی پر بھی پڑا ہے اور اسی لئے اکثر ان کی کامیابی غیر یقینی رہتی ہے جن اسلامی ممالک میں مصلحین نے اسلام کے ان مرکزی اداروں کے ساتھ تعلق قائم رکھا بلکہ انہی کو مرکز بنا کر انہی کے ذریعہ سے اصلاح و انقلاب کی تحریکیں چلائیں وہاں وہ کامیاب رہے۔ مگر برصغیر پاک و ہند اور دیگر مسلم ممالک میں خاص طور پر وہ متکلم مصلحین جو سیاسی و عمرانی مسائل میں زیادہ شغف رکھتے تھے۔ ان اہم تاریخی مراکز سے دور جا پڑے۔ انہوں نے تصوف اور اس کے تربیتی اداروں کو تو اکثر صورتوں میں یوں رد کر دیا۔ جیسے یہ مسلمانوں کے علاوہ کسی غیر قوم کی ثقافت کا حصہ ہوں۔

اقبال اس صدی کے بہت بڑے حکیم و مفکر تھے۔ انہوں نے تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کا خاندانی پس منظر بھی صوفیاء سے ان کی نسبت میں مؤید تھا۔ مگر انہوں نے اپنے فلسفہ خودی کے سیاق و سباق میں تصوف کی بعض باتوں پر تنقید کی اور گو یہ تنقید ایسی ہی تھی جیسی اکثر صوفیاء خود تصوف کے بارے میں کیا کرتے تھے۔ تاہم بعض بزرگوں نے اس پر بحث شروع کر دی بات بڑھی تو تصوف کے اہم اور غیر اہم ہونے پر بھی بات چل نکلی اور گو اقبال بنیادی طور پر فلسفی کی بجائے صوفی تھے۔ لیکن ان کے قلم سے کچھ ایسی باتیں نکلیں جنہیں منکرین تصوف لے اڑے اور اقبال کے حوالے سے انہیں بھی تصوف کی مخالفت میں جا بجا پیش کرنے

لگے حالانکہ اقبال کا کلام دیکھا جائے بلکہ ان کے اسلوب زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو وہ سارے کا سارا صوفیوں کے رنگ میں ہے۔ انہوں نے فلسفیوں کی تعریف نہیں کی لیکن ولیوں اور صوفیوں کی تعریف میں وہ ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جس شخص کی ساری زندگی اور شاعری صوفیانہ جذبوں اور کیفیتوں سے مملو تھی' اس کا نام بھی منکرین تصوف نے اپنے مؤیدین کی فہرست میں شامل کر لیا۔ حالانکہ اقبالیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

بہر صورت یہ وہ حالات تھے جن میں تصوف اور اس کی افادیت کے خلاف شکوک پھیلتے چلے گئے اور خاص طور پر پڑھے لکھے لوگ اس کے نظریات اور اس کے اداروں سے بدظن ہو گئے۔

جب تصوف کے خلاف یہ سب اسباب کام کر رہے تھے۔ تو صوفیاء کی طرف سے ان کے سدباب کے لئے کوئی خاص کوشش نہ کی گئی۔ کسی نے مؤثر طور پر تقریر کے ذریعے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا نہ تحریر کے ذریعے ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے کوئی قابل ذکر کام کیا۔ دراصل صوفیاء کا یہ کام بھی نہیں ہے۔ صوفیا نے ہمیشہ اپنی خانقاہوں' زاویوں اور جماعت خانوں میں خاموشی سے تعلیم و تربیت کا کام جاری رکھا ہے اور اگر ان کی مخالفت کی گئی تو ان کا جواب ہمیشہ خاموش خدمت رہا ہے۔ جدید دور کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے مخالفت' بے اعتنائی اور بدظنی کے اس ماحول میں علم تصوف ہی نسیاً منسیا ہوا' نہ صوفیوں نے ہی اپنے مشاغل ترک کئے۔ صرف یہ ہوا کہ خانقاہوں میں سے اس ماحول کی غلط فہمیوں سے پاک کرنے کی چونکہ کوئی کوشش نہ کی گئی' اس لئے بظاہر یہ بعد محض اس بناء پر بڑھتا گیا کہ صوفیاء نے اس عرصے میں اپنے طریق و سلوک کے جواز میں علمی و تحقیقی سطح پر کچھ کہنے کے لئے اپنے تئیں تیار نہیں پایا۔ انہیں مورد الزام بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا اپنا ایک مسلک ہے اور وہ اسی کے مطابق عمل پیرا

www.yabahu.com

ہوتے ہیں مثلاً" صوفیاء اور مشائخ کبار میں سے بعض نے کتب و رسائل ضرور تصنیف کئے مگر جیسا کہ مارٹن لنگز نے (جن کا اسلامی نام ابوبکر سراج الدین ہے) کہا ہے صوفیاء کا کام رسائل لکھنا نہیں ہے' ان کے عبادات اور تعلیم و تدریس کے اپنے مشاغل ہیں وہ انہی پرزور دیتے ہیں اور ان پر کار بند ہونے کے علاوہ وہ دوسرے کاموں کو حتیٰ کہ اپنی مخالفت کو بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ جدید دور کے مصلحین کرام کی بے نیازی یا مخالفت نے صوفیاء کی جمعیت خاطر کو درہم برہم نہیں کیا۔ وہ اب بھی اپنی روایات کے مطابق کسی نہ کسی طرح کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ متاخرین کی خاندانی سجادہ نشینی کی روایت کے ساتھ کہیں تو محض قالب رہ گیا ہے' روح گم ہو چکی ہے اور کہیں واقعی تصوف و سلوک کے صحیح اصولوں کے مطابق کام جاری بھی ہے۔ تصوف کی تاریخ میں دیکھا جائے تو ایسا ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے اور تصوف کے علم و عمل میں کچھ ایسی مخفی قوت پر اسرار طور پر کار فرما رہتی ہے کہ اصلاح و درستی کی کوئی نہ کوئی صورت خود بخود نکل آتی ہے مثلاً" ایک خانوادے کے ہاں سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو کوئی اور خانوادہ ظاہر ہو کر جذب و جنون کے نئے دور کی ابتداء کر دیتا ہے(۳) صوفیاء کے گروہ میں خانقاہوں اور زاویوں کے ذریعہ یا ان کے بغیر بھی کسی ولی کے ذریعہ انفرادی سطح پر اسی طرح کام جاری رہا ہے۔

تصوّف کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت :۔

تصوف میں چونکہ انسانی فطرت کے بعض اہم تقاضوں کا جواب موجود ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ میں نشیب و فراز کے ساتھ اس کا دور دورہ تو اسی طرح رہے گا مگر موجودہ فضا کو روح عصر کی پذیرائی کے لئے علمی سطح پر تصوف کے خلاف ظنون و شکوک سے پاک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے اس مرحلے پر سریت پسندی کے شوق میں پڑھے لکھے لوگ جب تصوف

کی طرف رجوع کریں تو وہ تصوف کے نظریہ و عمل کو معقول انداز میں سمجھ سکیں۔

اس مقصد کے پیش نظر تصوف کے خلاف متذکرہ بالا حلقوں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا اگر جواب لکھنے کی کوشش کی جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے اور کہاں تحریر و تقریر کو اس بارے میں کسی منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ اعتراضات کے طومار کا یہ حال ہے کہ اگر بیک وقت سب کا جواب لکھنے بیٹھیں تو عبادت میں ارتباط بھی مشکل سے قائم رہ سکتا ہے۔ اس لئے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے ان اعتراضات سے تو قطع نظر کیا جا سکتا ہے جو کم علمی' غلط فہمی یا بدظنی کا نتیجہ ہیں مگر کچھ اعتراضات ایسی بنیادی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق سنجیدہ علمی تحقیق سے ہے نیز ان کی نوعیت ان اعتراضات سے نسبتاً" مختلف ہے جو فقہا اور ظاہر پرست علماء کی طرف سے صوفیا پر کئے جاتے رہے اور جن سے قدیم تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

قابلِ غور مسائل:۔

ہر قسم کے اعتراضات زیر بحث لانے کی بجائے فی الحال یہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ تقاضائے وقت کے پیش نظر تصوف کے صرف ان مسائل پر بات کی جائے جو موجودہ فضا میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں الجھنیں پیدا کر سکتے ہیں۔

پڑھے لکھے لوگوں میں جو تصوف کا سطحی مطالعہ رکھتے ہیں بد عقیدگی کی یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ ان کے ذہن میں سریت (مسٹزم) اور تصوف کا فرق واضح نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اس بات کے سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں۔ جس طرح مختلف مذاہب کے درمیان کچھ عناصر مشترک نظر آتے ہیں اسی طرح سریت اور تصوف میں بھی کچھ خصوصیات ایک جیسی یا ملتی جلتی ہیں بلکہ اس امر کو اگر یوں پیش کیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ سریت عام ہے اور تصوف کی اصطلاح اسلام کے سری سلوک کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ جیسا کہ

www.yabahu.com

تفصیلاً" آگے ذکر آئے گا۔ تصوف اسلام کا ہی باطنی رخ ہے۔

کچھ لوگ جنہیں نفسیات سے دلچسپی ہے اور تصوف کے متعلق ان کی معلومات سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں جب صوفیوں کی بعض مواجید اور ان کے بعض فوق العادۃ کاموں کو جنہیں عوام بغیر کسی تخصیص اور امتیاز کے کرامت کا نام دے دیتے ہیں پڑھتے یا سنتے ہیں تو ان کا خیال فوراً" مسٹزم، ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ صوفیوں کے تجربات کی صحیح نوعیت کو وہ سمجھ نہیں پاتے کہ خود تصوف کا مطالعہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں نہ براہ راست صوفیوں کے حلقے میں کبھی بیٹھنے کا موقع پاتے ہیں اس لئے وہ صوفیوں کی تمام مواجید و کیفیات کو محض ایک قسم کے نفسیاتی تجربے خیال کرتے ہیں۔

سرّیت اور تصوف کا علمی ماخذ وجدان اور عقل کلی ہے۔ وجدان پہ اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے خاص طور پر جو لوگ اقبال کے افکار کو سنجیدگی سے دوران تعلیم یا اس کے بعد مطالعہ کرتے رہے ہیں ان کے لئے اس کا بیان کچھ نیا نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے لکھا ہے اس امر کی عام طور پر وضاحت نہیں کی جاتی ہے کہ مغرب والے وجدان کو جبلت کی ہی ایک ترقی یافتہ صورت کے معنوں میں استعمال کرتے رہے ہیں (۴) جب کہ صوفیا نے عقل کلی اور بعض اوقات وسیع اور جامع مفہوم کے لئے "عشق" کی اصطلاح استعمال کی ہے جو صوفیا کے روحانی تجربات کا سبب بنتی ہے۔ اگر وجدان کی اصطلاح پر ہی اصرار کیا جائے تو پھر تصریح ضروری ہے کہ وجدان کا ایک مذہبی و روحانی رخ بھی ہے اور جہاں وجدان ایک لا دینی برتری فلسفے کا ماخذ بن سکتا ہے اور بنا ہے وہاں اسی کو اگر مذہبی و روحانی رُخ کے مقابل کیا جائے تو یہ عقل کلی سے جا ملتا ہے اور اس کے ذریعے الٰہیات کی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ اندر کی آنکھ بیدار اور روشن ہو جاتی ہے اور صوفیوں کے تجربات و مشاہدات قابل فہم نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور کے متکلمین کے مباحث میں یہ غلط خیال بہت معروف ہے کہ

تصوف کے منابع اسلام سے کہیں باہر ہیں (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ اس میں گذشتہ دور کے مستشرقین کی تحقیق خام کو بھی دخل ہے) اور بقول ان کے اس کے نظریات اور طریق عمل کو رواج اس وقت ہوا ہے جب عجمی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی قبولیت کے باوجود وہ اپنے اپنے مذاہب کے سری سلوک کو نہ چھوڑ سکے اور بالآخر ایران اور ہندوستان اور بعد ازاں عالم اسلام میں اس کا رواج عام ہو گیا۔ یہ مسئلہ اگرچہ بالکل نیا نہیں ہے لیکن اب کے صوفی مفکرین کے بعض افکار اور ان کے طرق کے بعض اطوار کو تجزیاتی اور تاریخی رنگ دے کر زیادہ زور سے بظاہر تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے اس رنگ میں جس قسم کے اعتراضات تھے وہ متشددین اور منکرین تصوف کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو محض فروعات سے متعلق ہوتے تھے۔ مگر اب انہی باتوں کو ذرا بل دے کر ایسے پیش کیا جاتا ہے گویا تصوف میں سب کچھ باہر سے آیا ہے اور اسلامی تاریخ کے دائرہ سے باہر کہیں اس کی جڑیں کھلی ہیں۔

تصوف کی بعض اصطلاحات بھی مادیت پرستی کے اس دور میں لوگوں کی سوچ میں کھٹکنے لگی ہیں۔ ترک دنیا، زہد و ریاضت، مخالفت نفس اور فنا و فقر وغیرہ کا مفہوم جو صوفیوں کے نزدیک متعین تھا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ان کے لغوی مفہوم کو سامنے رکھ کر کبھی انہیں غیر انسانی کہا جاتا ہے۔ اور کبھی انہیں غیر اسلامی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ صوفیوں کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کی وضاحت کریں اور ان کی وضاحت بارہا کی گئی ہے لیکن فنا جیسی قوت بخش روحانی کیفیت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی انا کی یا خودی کی موت ہے اور اس سے کردار کی انفرادیت و طاقت ختم ہو جاتی ہے یا جماعت کی سطح پر بے عملی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسری اصطلاحات کا ہے۔ یہ سب کسی زمانے میں مومن کے کردار کی تعمیر اور تکمیل کے بیان میں عام استعمال ہوتی تھیں اور ان سے کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوتی تھی مگر اب ان کی تاویل محض

www.yabahu.com

مسئلہ کو الجھانے کے لئے صوفیوں کی تشریحات سے ہٹ کر اپنے طور پر کر لی جاتی ہے اور اپنے اعتراضات کو تقویت دینے کے لئے بعض منکرین تصوف بار بار انہیں دہراتے نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مخالفت کرتے ہوئے یہ خدشہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے باطن کی طرف رخ مڑ جائے گا۔ اور ظاہری مادی ترقی رک جائے گی لیکن یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ تصوف تو ظاہر کی حفاظت کے لئے اور مادی نظام کے توازن کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے ورنہ باطن کو نظر انداز کر کے محض ظاہری ترقی کا نتیجہ تو وہی ہوتا ہے جو مغرب میں ظاہر ہوا ہے' اخلاق فاسد ہوئے اور زندگی کے ہر شعبے میں کجی یا گمراہی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو گئی۔

اسی کے ساتھ تصوف کے بعض اداروں کے خلاف کد محسوس کی جاتی ہے۔ پرانے ظاہر پسند علماء صوفیوں کی خانقاہوں اور زاویوں کو شریک کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور موجودہ دور کے متکلمین انہیں بیکار اور مذہبی جذبات کے استحصال کے مراکز خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ خانقاہ یا زاویہ ایسی جگہ ہوتی ہے۔ جہاں مسجد' لنگر خانہ' مدرسہ ذکر الٰہی کے لئے خلوت گاہ' اعلیٰ روحانی تعلیم کے لئے مرشد اور صحبت روحانی کے لئے درویش سب موجود ہوتے ہیں ممکن ہے بعض خانقاہیں یہ سب لوازمات نہ رکھتی ہوں یا پرانی روایت کے مطابق کام نہ کر رہی ہوں مگر اس بناء پر ان کو رد تو نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اصلاح ہو سکتی ہے اور ان سے وہی کام لیا جا سکتا ہے جو پہلے کبھی لیا جاتا تھا۔

ترتیب :۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ایک بڑی عجیب سی صورت حال ہے کہ تصوف پر لکھنے یا بولنے کی کوشش کی جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے بات شروع کی جائے۔ تصوف کی اصطلاح اور اس کی تعریف سے لے کر اس کے منتہائے مقصود تک اعتراضات کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو مختلف الخیال لوگوں یا گروہوں کی طرف

سے تصوف کے خلاف تقریر و تحریر میں ملتا ہے اس لئے تصوف پر عمومی نقطۂ نظر سے لکھنے کے لئے بھی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اور نہایت سنجیدگی سے سوچنا پڑتا ہے۔ کہ کن کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ بہر صورت متذکرہ بالا سطور میں جدید دور کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں جو مسائل تصوف کے بارے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انہیں مختصراً" بیان کر دیا گیا ہے ان میں سے بعض کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور پڑھے لکھے متین طبقے میں یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تصوف کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ اسی کام کو آگے بڑھانے کے لئے آئندہ صفحات پہ بعض اہم مسائل کو کہیں الگ عنوان کے ساتھ اور کہیں ضمناً" بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے تاکہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جا سکے یا جدید دور میں تصوف کے بارے میں ذہنوں میں جو اشکال پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کیا جا سکے۔

-☆☆☆-

www.yabahu.com

سِرّیت
(مِسٹسِزم)

سِرّیت اور تَصوّف :۔

سب سے پہلے سرّیت اور تصوف میں فرق ملاحظہ فرمایئے آج کل پڑھے لکھے لوگ جب تصوف پر بات کرتے ہیں تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ سریت اور تصوف میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ چنانچہ خلط مبحث سے بات کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتی یا اس سے غلط نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اسی طرح وجدان کی اصطلاح کو صوفیا کی اصطلاحات دید، نظر، نگاہ، عقل کلی اور عشق کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صوفیا کے کشف و اشراق کی حقیقت واضح نہیں ہو پاتی۔ چاہیے کہ تصوف پر بات کرتے ہوئے ان کے مفاہیم متعین کر لئے جائیں تاکہ اصل موضوع کی صحیح وضاحت ہو سکے۔

کئی بزرگوں کی حالیہ تصانیف میں دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے انگریزی لفظ مسٹسزم Mystisism (جس کا ترجمہ سرّیت کیا جا سکتا ہے) اور تصوف کو ہم معنی قرار دیتے ہوئے محققانہ گفتگو کی ہے۔ بظاہر انہوں نے اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی لیکن انجام کار وہ تصوف کے تفصیلی بیان کے باوجود اس کے حقیقی خد و خال واضح نہیں کر سکے۔ ماضی میں ہم نے دیکھا کہ بہت سی غلط فہمیاں اسی سبب سے پیدا ہوئی ہیں۔ تصوف پر اعتراضات کرتے ہوئے اکثر معترضین تصوف کو مطعون کرنے کے لئے دوسرے مذاہب کے سری مسالک کی خامیاں بیان کرنے لگتے ہیں

اور نام تصوف کا لیتے ہیں اس بنا پر مطلب کی وضاحت میں دقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اگر پہلے سے یہ طے ہو جائے کہ سریت (مسٹسزم) دیگر تمام مذاہب و مسالک کے ساتھ عام ہے اور تصوف کی اصطلاح سرتا سر مذہب اسلام کے سری مسلک سے وابستہ ہے تو گفتگو کے لئے با آسانی نتیجہ خیز طور پر آگے بڑھنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ یہ بات تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ہر مذہب کا ایک ظاہری رخ ہوتا ہے اور دوسرا باطنی۔ باطنی رخ ہمیشہ مذہب کے باطنی اسرار پیش کرتا ہے۔ اسی لئے عیسائیت کے سری مسلک کو لفظ "مسٹسزم" سے ادا کیا گیا ہے جس کے معنی بنیادی طور پر "دینی اسرار" بیان کئے گئے ہیں۔ یہی حال دوسرے مذاہب کا ہے۔ اسلام کا بھی ایک باطنی پرت ہے جسے دینی علوم کی اصطلاح میں "تصوف" کہا گیا۔ اور یہ خالصتاً" اسلام کے سری مسلک سے متعلق ہے۔ اب گفتگو میں جب تصوف کی اصطلاح عام سریت کے لئے استعمال کی جاتی ہے تو تصوف اسلامی کا امتیاز اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعتراضات تصوف کے سرمنڈھ دیئے جاتے ہیں جو صرف دوسرے مذاہب کے سری مسالک پر صادق آتے ہیں۔

سِرّیت اور تصوّف میں وجہِ اِشتراک و اِختلاف :۔

ایسا در اصل اس لئے ہوا کہ سریت اور تصوف میں بہت سی بنیادی خصوصیات مشترک ہیں مگر آخر میں ایمان و عقائد کے پس منظر کے ساتھ جہاں اختلاف پیدا ہوتا ہے وہاں تصوف اور دیگر سری مسالک میں فرق صاف نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف اور دیگر سری مسالک میں ایک حد تک تو مشابہت دکھائی دیتی ہے مگر آخر میں تصوف اسلام کے دینی علم و عمل کا ہی ایک شعبہ نظر آتا ہے جس کے خصائص و فضائل عام سریت سے بالکل الگ اور جدا ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک ملک میں نبی و رسول بھیجے اور اقوام عالم کے لئے ادیان کا نظام قائم کیا۔ ہر دین میں بنیادی عقیدہ توحید تھا۔ التوحید واحد۔ اسی طرح ہر

www.yabahu.com

ایک دین میں منسلک عبادت بھی تجویز کئے گئے جن کا مقصد ہر دور میں افراد کے اخلاقی کردار کی تعمیر اور سیرت روحانی کی تشکیل تھا۔ چنانچہ مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے بہت سی باتیں ان میں مشترک ملتی ہیں۔ ان کے سری مسالک کا بھی یہی حال ہے چنانچہ محققین نے ہر دین کے صحف آسمانی میں خواہ ان میں کتنی ہی تحریف کی جا چکی ہے توحید کا عقیدہ ثابت کیا ہے۔ اسی طرح سری مسالک میں بھی طریقے گو جدا جدا ہوں مگر ابتدائی سطح پر بعض صورتوں میں فوائد ایک جیسے حاصل ہوتے ہیں۔

اقسام فلسفہ کی بحث میں بعض فلسفیوں کے نظریات کا تعلق لا دینی سری مسالک کے سلاسل سے جا ملتا ہے۔ ایک حد تک ان میں بھی مماثلت کے کچھ پہلو مل جاتے ہیں۔ خاص طور پر نچلی سطح پر محدود صورتوں میں سری تجربے کے خصائص ایک سے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا مطالعہ کرتے ہوئے لازم آتا ہے کہ دینی و لا دینی سریت اور تصوف کے مشترکہ و مختلفہ ہر دو نوع کے خصائص پیش نظر رکھے جائیں۔

صُوفیانہ اور سِرّی تجربات و اصُول کے مُشترکہ خصائص :۔

سریت پسند اور صوفی عام طور پر اپنے سری و روحانی تجربات و مشاہدات کا تجزیہ نہیں کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ان کا حاسہ باطنی اتنا تیز اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ وہ انہیں واقعہ کے تجزیہ کی بجائے اس کا کلی احاطہ کر کے اس کی کنہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ یقین کی ایسی قوت ہوتی ہے جو کسی معروضی تجزیہ کے ذریعہ ابلاغ کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں پھر عام عقل جزوی کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اکثر وہ اس سہارے کو نظر انداز کئے رہتے ہیں کیونکہ ان کا یقین ایسا متعدی ہوتا ہے کہ دوسروں کے وجدان یا حاسہ باطنی کو بھی خود بخود اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور وہ بھی اکثر بغیر

دلیل کے ان تجربات یا ان پر مبنی نتائج و نظریات کی قبولیت پر مائل ہو جاتے ہیں۔

بایں ہمہ ان حکماء علماء نے جن کی فکر میں تجزیاتی و تحقیقی طریقِ کار پُر فرما ہوتا ہے اس پر کچھ کام ضرور کیا ہے اور غور و خوض کے بعد سری اور صوفیانہ تجربات کے کچھ مشترکہ خصائص ڈھونڈ نکالے ہیں۔

ولیم جیمز نے سری احوال و تجربات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی چار علامات بیان کی ہیں۔ پہلی علامت یہ ہے کہ صاحب حال کے لئے اس کا سری تجربہ بے مثل اور ناقابل بیان ہوتا ہے یعنی جیسے وہ مخصوص آدمی اس کائنات میں بے مثل ہے اسی طرح اس کا تجربہ بھی بے مثل ہے اور گو ایسے تجربات بیان میں آتے رہتے ہیں لیکن انہیں کماحقہ' اور بعینہٖ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری علامت یہ ہے کہ "اس قسم کا صاحب حال شخص اپنی اس شعوری کیفیت کو جذبہ و تاثیر سے مشابہ ہونے کے باوجود علم و عرفان کی کیفیت سمجھتا ہے جس کی بدولت حقیقت حیات کی اتھاہ گہرائیاں اس پر منکشف ہوتی ہیں جہاں استدلالی عقل کی رسائی نہیں۔" تیسری علامت یہ ہے کہ یہ حالتیں مستقل ہوتی ہیں نہ دیرپا مگر ان کا اعادہ و تکرار ممکن ہے۔ "بعد میں ایک بار یا کئی بار اعادہ و تکرار میں وہ کیفیت ترقی یافتہ صورت اختیار کرتی ہے اور اس کی وسعت' اس کی گہرائی اور اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔" اور چوتھی علامت یہ ہے کہ "ارادہ و کوشش سے یا توجہ سے جسمانی احوال سے ان احوال کے ورود کے لئے راستہ صاف کیا جا سکتا ہے لیکن ورود کے بعد صاحب حال کی قوتِ ارادی بالکل معطل ہو جاتی ہے۔" مختلف سری مسالک میں ایسی ذہنی و جسمانی مشقیں مقرر ہیں جن سے باطنی حاسہ کو بیدار کیا جاتا ہے یا اسے تجربات کے لئے تیار کیا جاتا ہے جیسے تنہائی' بھوک' یوگا کی مشقوں اور طہارت و عبادت کے ذریعے سے مقصود حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر جب کوئی کیفیت وارد ہوتی ہے تو صاحب حال کا سارا وجود اس کے تاثر میں محو ہو جاتا ہے اور اس کی انا کی دیگر قوتیں از

www.yabahu.com

قسم ارادہ وغیرہ اتنی دیر کے لئے تعطل پذیر رہتی ہیں۔ ولیم جیمز نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بعض سالکین اپنے ارتقاء کے درجۂ کمال میں نہایت منظم تجربات و احوال کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی بناء پر ایک فلسفہ بھی تعمیر کرتے ہیں (۵)۔ چنانچہ سریت پسند فلسفیوں کے نظریات و افکار کا ماخذ ایسے ہی تجربات ہوتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے ہوں یا حوالہ کی غرض سے دوسروں سے نقل کئے گئے ہوں۔

ایک انگریز ایف ۔ سی ۔ ہیولڈ نے اپنی کتاب "مسٹزم" میں ان کے علاوہ "روحانی واردات" کی تین اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ یعنی احساس وحدت' لازمانیت اور عرفان انائے مطلقہ (۶)۔ ان تین خصوصیات کی تشریح یہ ہے کہ سریت پسند یا صوفی اپنی روحانی کیفیت کے دوران میں دریائے وحدت کی ایک لہر بن جاتا ہے۔ کثرت اس کے لئے معدوم کا مفہوم رکھتی ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے اپنے وجود سمیت وحدت میں ڈھل جاتی ہے جیسے ایک ہی وجود ہے جو ہر شے پر محیط ہے اور کوئی شے وجود واحد سے باہر نہیں' تمام تفرقات اور امتیازات مٹ گئے ہیں اور ایک روح ہے کہ اس کائنات کی رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ لازمانیت کا مطلب یہ ہے کہ سری تجربے کے دوران میں صاحب حال شخص ماضی و مستقبل سے بلند ہو کر دوران خاص میں سانس لیتا ہے۔ جہاں وقت کو محض ایک آن واحد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں زمان مسلسل یعنی امتیاز شب و روز اور ماہ و سال ختم ہو جاتا ہے اور جہاں ماضی و مستقبل کی تقسیم نہیں ہوتی یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں سب وقت "حال" بن جاتا ہے۔

ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دِن ہے نہ رات

ڈاکٹر محمد معروف نے اقبال کے فلسفہ' مذہب پر مقالہ لکھتے ہوئے اپنے مطالعہ کے محاصل کے طور پر سری و روحانی تجربات کے مندرجہ ذیل خصائص کو تقریباً مسلمہ قرار دیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ روحانی تجربہ:

۱۔ ان معنوں میں ناقابل بیان ہوتا ہے۔ کہ بعینہ بہ تمام و کمال اس کا ابلاغ ممکن نہیں۔

۲۔ فوری نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کا براہ راست کشف ہوتا ہے۔

۳۔ ناقابل تجزیہ ہوتا ہے۔

۴۔ دیرپا نہیں ہوتا۔

۵۔ مغلوبیت و محویت کی کیفیت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

۶۔ معبود سے وصل کی صفت رکھتا ہے۔

۷۔ جذبہ و تخیل کی اس میں آمیزش ہوتی ہے۔ وغیرہ(۷)

مسلمان صوفیاء میں حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ نے ان خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے مشاہدہ و علم کی رو سے روحانی علم ہو یا روحانی تجربہ:

۱۔ فیض الٰہی کی تجلی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ دماغ کی مکمل مغلوبیت کی کیفیت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ یہ انوار کی شکل میں دل پہ چھا جاتا ہے اس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ عقل تجزیہ کار کے دائرے سے باہر ہوتا ہے۔

۴۔ اس سے یقین حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ اس سے حقیقت کا مکمل علم حاصل ہوتا ہے۔(۸)

صوفی ہو یا سریت پسند' وہ ان واردات و تجربات میں محسوس کرتا ہے کہ اس کی انفرادی "انا" جو بظاہر جسمانی نظام اور دماغی واقعات سے وابستہ ہے' پھیل کر ایک انائے بسیط سے جا ملی ہے۔ واردات کے دوران اس کی نظر میں اپنی انفرادی ذات جو انقلاب و زوال کا تختہ مشق بنی رہتی ہے جب اس انا سے جا ملتی ہے جو مسلسل' غیر منقلب' ہمہ گیر اور وقت کی قیود سے باہر ہے تو اسے بے پناہ قوت کا

www.yabahu.com

احساس ہوتا ہے۔ اب یہاں اس قدر اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ دین دار یا لا دین سریت پسند سالکین کے عرفان میں اشتراک کی حد بس یہیں تک ہے مگر صوفی اپنی معرفت میں آگے بڑھ جاتا ہے اور اس منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اس کی تفصیل آگے بیان ہو گی۔

سریّت (مسٹسزم) کے خصائص :۔

برٹرینڈ رسل نے تجربے کے بارے میں تو بات نہیں کی البتہ تجربات کی روشنی میں سریت پسندوں کی فکر کے خصائص کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے جبلت و وجدان کو سری تجربات کا منبع قرار دیا ہے اور اس کے نزدیک سریت کی بنیاد چار بنیادی عقائد پر ہے۔

۱۔ سریت پسند سالک تعقل کے مقابلے میں وجدان کو ذریعہ علم و عرفان سمجھتا ہے۔

۲۔ کثرت کی بجائے وحدت پر ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ وقت کو ماضی و مستقبل کی تقسیم سے ماورا خیال کرتا ہے۔

۴۔ شر اس کی نظر میں محض ایک ظاہری و وقتی چیز ہے۔

یہ سب عقائد صوفی یا سریت پسند سالک کے روحانی کشوف اور تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔(۹)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے "تاریخ تصوف" میں سریت کے بنیادی اصول یہ بیان کئے ہیں۔

۱۔ "حقیقت واحدہ ہے' صرف ایک ہے' لا شریک ہے' وحدۃ مطلقہ ہے۔ اسی کو صوفی "الحق" سے تعبیر کرتا ہے"۔

۲۔ "یہ حقیقت واحدہ زبان اور بیان' تحریر اور تقریر کی گرفت سے باہر ہے"۔

۳۔ "روح انسانی اگر باعتبار تعین غیر حق ہے مگر باعتبار وجود عین حق ہے"۔

۴۔ "اس وحدت مطلقہ سے وصل ممکن ہے۔"

۵۔ "طریق وصل "عشق" ہے۔"

۶۔ "عشق کی صفت عاشقوں کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے۔"(۱۰)

وجدان :۔

تمام سری تجربات و کشوف اور ان سے ماخوذ اصولوں کے پیچھے ایک ملکہ کارفرما ہوتا ہے جسے عام طور پر وجدان کہتے ہیں۔ وجدان کو عموماً استدلالی عقل کے مقابل ایک قوت سمجھا گیا ہے۔ خرد پسند حکماء وجدان کو جبلت کی ہی ایک صورت بتاتے ہیں کیونکہ جبلت اور وجدان کارکردگی میں بہت حد تک مشابہ ہیں۔ ان کی یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کہ دونوں قوتیں ظاہری حواس کی مدد کے بغیر معلومات کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان کا عمل اس قدر فوری ہوتا ہے کہ معلومات کو براہ راست معلومات کنندہ کے سامنے حاضر کر دیتی ہیں۔ ان معلومات کے حصول کے بعد تیقن و اطمینان کی خاطر مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں رہتی اور فیصلہ و عمل میں دیر نہیں لگتی۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ حیوانی سطح پر جبلت کام کرتی ہے اور انسانی سطح پر یہی قوت برتر انداز میں کار فرما ہوتی ہے تو اسے وجدان کا نام دیتے ہیں۔ بہر صورت سریت پسندوں کے سری تجربات پر بات کرتے ہوئے جبلت و وجدان کو ایک قرار دیا جائے۔ یا انہیں الگ الگ دو قوتیں تسلیم کیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ صوفیائے کرام کے کشوف والہامات کا جائزہ لیتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ کہ وہاں حاسہ باطنی کی نہ صرف کیفیت اور ہوتی ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس کی نوعیت بھی جدا ہے۔ اس لئے مناسب ہو گا کہ وہاں اس حاسہ کی ہمہ گیری و وسعت کو دیکھتے ہوئے عقل کلی کی اصطلاح استعمال کی جائے یا عقلی وجدان کی جس سے بیان میں زیادہ وضاحت پیدا ہو سکتی ہے۔(۱۱)

وجدان کی قوت تمام انسانی صلاحیتوں کی طرح بنیادی طور پر ایک وہبی

www.yabahu.com

صلاحیت ہے مگر اس کی جلاء مشق و ریاضت اور شوق پر منحصر ہے۔ مختلف ریاضتوں کے ذریعہ طبیعت میں لطافت پیدا کی جاتی ہے۔ اور سری واردات کے لئے اپنے تئیں مستعد کیا جاتا ہے۔ ابتدائی سطح پر وجدانی معلومات کی صورتیں بظاہر سریت و تصوف کے سالکین کے ہاں ایک سی نظر آتی ہیں البتہ صوفی کا منبع ادراک چونکہ جدا ہوتا ہے۔ اس لئے صوفی آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کی واردات کے معنی و مفہوم اور درجۂ معرفت میں دوسروں سے امتیاز واضح ہو جاتا ہے۔ بہرحال ابتداً مشابہت ضرور نظر آتی ہے۔ کبھی کوئی منظر سامنے آ جاتا ہے جو بسا اوقات حال کے کسی مسئلے کو منکشف کرتا ہے۔ یا مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو حاضر کر دیتا ہے۔ کبھی غیب سے کوئی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے سوال کا جواب دیتی ہے جو ذہن میں چکر لگا رہا ہوتا ہے یا کبھی الفاظ خود بخود کسی جملے یا مصرعے کی صورت میں زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ وجدان کا طریق کار منزل بہ منزل راستہ طے کرنے کا نہیں ہے بلکہ وجدان کے ذریعے آن واحد میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اگر ان پر عمل درکار ہو تو صاحب حال شخص کو تامل و تفکر یا تذبذب سے سابقہ ہرگز نہیں پڑتا۔

جبلّت اور وجدان کی کارکردگی :-

جبلّت حیوانوں میں خطرات، مشکلات یا پریشانیوں کے موقع پر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ کام کرتی ہے۔ کسی موقع پر خطرے سے آگاہی اور حفظ حیات کے لئے عملی اقدام کی فوری ترغیب میں جبلت کی کارکردگی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ فیصلہ و عمل کا کام ایک لمحے میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ انسانی سطح پر جب وجدان کی وسعت کار کو ہم دیکھتے ہیں تو ہماری اکثر تہذیبی ترقیاں، سائنسی ایجادات، فکری نظریات اور خیالات تازہ کا انبار سب وجدان کی بدولت ہے۔ وجدان کا طریق کار وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

وجدان اور عقل :-

وجدان کی بحث میں عقل کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جسے خرد، فکر، دانش، عقل استدلالی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کچھ یہ بات بھی ہے کہ جب تک عقل و خرد اور وجدان کا موازنہ نہ کیا جائے وجدان کے اوصاف واضح نہیں ہو پاتے۔ دونوں ہی یافت و ادراک حقائق کے معروف ذرائع ہیں اور دونوں کا اپنا طریق کار ہے۔ صوفی اور سریت پسند دونوں کے ہاں وجدان اور عقل پر بحثیں ملتی ہیں۔ عقل انسانوں کی امتیازی صفت ہے۔ حیوانوں میں معمولی سوجھ بوجھ تو ہو سکتی ہے مگر اسے عقل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ عقل صرف انسانوں کو ودیعت کی گئی ہے اور انسانوں نے تہذیب و تمدن کے کسی شعبے میں ترقی کی ہے تو عقل کا عمل دخل اس میں موجود رہا ہے۔ یہ وہ انسانی ملکہ ہے جس کے مقام و محل عمل کے بارے میں تو باتیں ہوئیں مگر اسے مکمل طور پر رد کوئی نہیں کر سکا۔ سریت پسند فلسفیوں اور صوفیاء کرام نے صرف یہ کیا کہ اس کی نسبت حاسۂ باطنی یا وجدان کو برتر حیثیت دی اور اسے دوسرے درجہ پر رکھا۔ ان کی رائے میں ان کے مسائل وجدان ہی حل کر سکتا ہے۔ خرد پسند حکماء نے عقل کو وسیلہ دانش اور معیار اعلیٰ قرار دیا تو صوفیوں اور سریت پسند حکماء نے اس کی اس حیثیت پر تنقید کی مگر اس کے باوجود عقل کو ناکارہ کسی نے قرار نہیں دیا۔ صرف اس کی حدود واضح کر دیں اور اپنے تجربات روحانی کے لئے وجدان کو چن لیا۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صوفی اس عقل کو عقل جزوی یا عقل معاش کہتے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے عقل جزوی ہو یا وجدان دونوں ہی کمتر درجے کے ذرائع علم ہیں اور وہ علومِ ربانی کے ذریعہ حصول کو عقل کلی کہتے ہیں۔

www.yabahu.com

عقل کا دائرہ کار :۔

خرد پسندوں کا کہنا ہے کہ عقل یا خرد ظن و تخمین سے کام لیتی ہے۔ سوال اٹھاتی ہے اور نہ صرف جواب مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ ان پر تنقید بھی کر لیتی ہے۔ عقل حواس خمسہ کے ذریعے جمع کئے گئے معلومات کے مواد کو ترتیب دیتی ہے' ان سے نتائج اخذ کرتی ہے' اصول و قوانین کی تدوین کرتی ہے اور منطقی اصولوں کے تحت بالواسطہ یا بلا واسطہ تصدیق یا تردید کے بعد فیصلے صادر کرتی ہے۔ گو اس طرح طریق کار بہت طویل اور محنت طلب نظر آتا ہے مگر اسکے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک حق کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے عقل ہی ذریعہ ہے اور عقل ہی معیار ہے۔ عقل کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جذبہ و جوش اور تعصب و نفرت سے بلند ہو کر آزادی اور غیر جانبداری کے ساتھ کام کرتی ہے۔ یہ کسی مذہب یا فرقے سے اپنے آپ کو متعلق نہیں کرتی اور غالب کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے۔

ہاں وہ نہیں خُدا پَرست' جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دِین و دِل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ روزانہ زندگی میں عقل کے بغیر ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے۔ آئے دن کی مشکلات میں عقل کی مہیا کردہ حکمت عملی کو رد کر دیا جائے تو ہمارے پاس کوئی ایسا چراغ نہیں ہے جو رہگذر کو روشن کر سکے۔

ان اوصاف سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن سریت پسند اور صوفیاء بار بار دہراتے ہیں کہ وہ ان مابعد الطبیعاتی حقائق کو مرکز توجہ بناتے ہیں جن تک عقل کی رسائی نہیں اور ان کی تصدیق کے لئے عقل کو آخری معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ جب ان حقائق کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہو تو یہ کام عقل کے ہی ذمہ ہے۔ اس لئے سری و وجدانی علوم کو مربوط انداز میں پیش کرنا ہو یا تفہیم کی خاطر

ایک فکری نظام یا اسلوب کے طور پر اس کی وضاحت مطلوب ہو تو یہ فریضہ عقل ہی سر انجام دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل و خرد کی افادیت کا کوئی منکر نہیں' صرف عقل کی کلی خود مختاری ناقابل قبول ٹھہری ہے۔

سریت اور فلسفہ :۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے اگرچہ عام طور پر تعقل پسند فلسفیوں کا ذریعہ علم عقل رہا ہے۔ اور حواس خمسہ کے ذریعے جمع شدہ معلومات کے ادراک اور اس کے نتائج و ثمرات پر ہی اعتماد کرتے ہیں۔ مگر اس گروہ میں ایسے حکماء بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے محض تعقل کو ناکافی خیال کرتے ہوئے نہ صرف وجدان سے راہنمائی حاصل کی بلکہ اپنے زیر غور مخصوص مسائل کے حل کے لئے وجدان کی برتری کا دعوی کیا۔ انہوں نے حسب توفیق وجدان سے روشنی حاصل کی اور اس روشنی میں انہوں نے جو کچھ دیکھا' ان کے نزدیک وہی معتبر اور قابل یقین ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ سریت (مسٹزم) کو مربوط فکر کا نام دیا گیا ہے اور ارنسٹ ہاکنگ نے نظری و عملی دونوں لحاظ سے سریت کو فلسفہ کی ہی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

ہاکنگ نے سریت کو بطور فلسفہ پیش کرتے ہوئے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں وجدانی افکار کا خلاصہ بیان کیا ہے اور اس بارے میں اس نے برٹرینڈ رسل کی نسبت قدرے زیادہ وضاحت کی ہے اس کے نزدیک سری فلسفے کے خصائص یہ ہیں۔

الف۔ حقیقت واحد ہے وہ ایک مکمل وحدت ہے۔

ب۔ یہ حقیقت ناقابل بیان ہے کیونکہ اندریں بارہ جو کچھ بھی بیان کریں۔ اور کسی امر پر اس کا اطلاق کریں' اس میں کسی نہ کسی پہلو یا جہت سے تصحیح و ترمیم کی ضرورت رہ جائے گی۔

ج۔ حقیقت (جب کہ ہم اسے باہر کی دنیا میں تلاش کرتے ہیں) انسانی فطرت کے اسی طرح ناقابل بیان جوہر کے ساتھ مماثل ہے۔ لہذا خواہ ہم خارج پر نظر

www.yabahu.com

ڈالتے ہوئے حقیقت کو پالیں یا باطن میں دیکھتے ہوئے اس کا ادراک کریں۔ حقیقت بہرحال اور بہر صورت فی نفسہٖ وہی رہے گی۔ انتہا پر دونوں سرے جا کر مل جاتے ہیں۔

د۔ اس واحد مطلق کی وجدانی معرفت یا اس سے وصال ممکن ہے بلکہ شدید حد تک اہم بھی۔

ر۔ حصول معرفت کے طریقہ میں کوشش بنیادی طور پر نظری نہیں بلکہ اخلاقی ہو گی۔(۱۲)

ہاکنگ نے یہ بات مکرر لکھی ہے کہ حقائق اشیاء کو دیکھنے یا جاننے کے لئے برگزیدہ نظر محض تفکر سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی سعی کا ثمر ہوتی ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے اخلاقی ہے۔ چنانچہ فلسفیانہ سطح پر اس نے عملی سری سلوک میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان کی رو سے سری سلوک میں یقین رکھنے والا فلسفی مذہب کی حدود کے قریب آ جاتا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں اخلاقی محاسبہ' تزکیۂ نفس' ترک دنیا' عبادات و مناسک' فقر خود اختیاری اور تقدیس عمل وغیرہ کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے' اسے مذہب کے حوالہ سے ہی بہتر طور پر سمجھا اور اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

مذہبی عقیدہ و عمل میں کشف و اشراق اور عبادات (جن میں انفرادی تزکیۂ نفس کے امور سے لے کر اجتماعی امور خیرات سب شامل ہیں) روحانی ارتقاء کے لئے بنیاد فراہم کرتے ہیں اور سری فلسفہ کی رو سے حصول علم و عرفان کے لئے وجدان اور اثبات و قیام خودی کے لئے سب اخلاقی و روحانی اقدار ضابطہ عمل قرار پاتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں اقبال نے عقل و خرد کے مقابلہ میں وجدان کو اہمیت دی اور خودی کی تعمیر و تشکیل کے لئے سلوک کا ایک خاص طریق بھی تجویز کیا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ سری سلوک میں یقین رکھنے والے سریت پسند فلسفی اپنی آزاد

خیالی کی بناء پر فقہاء مذہب کی نظر میں گردن زدنی بھی قرار پائے۔ تاریخ اسلام میں حلاج رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ شہاب الدین مقتول رحمتہ اللہ علیہ (جو صوفی بھی تھے) اور مغرب میں عیسائیوں کا برونو اور یہودیوں کا سپینوزا اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

بایں ہمہ یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وجدانی علوم کا مئوید فلسفی خدا پرست ہی ہو۔ برگساں نے وجدان کی طرف توجہ دلائی لیکن اس کے افکار کا ملحدانہ رنگ قائم رہا۔ ایسے میں عقائد حجاب بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برگساں کا فلسفہ مادیت کی سطح سے اوپر نہ جا سکا۔ اسی طرح سارتر وجودی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے وجدان کو ہی قوی ذریعہ علم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک سب علوم کا منبع وجدان ہے۔ دلائل و براہین اور استخراج محض آلات ہیں جو وجدان کی راہنمائی کرتے ہیں لیکن سارتر کا وجدان بھی الحاد پر مطمئن ہے چنانچہ اس دور میں اکثر مغربی حکماء جو وجدان کی تعریف کرتے ہوئے اس پر اعتماد کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مادیت اور نفس کی سطح سے بلند ہو کر بات نہیں کر سکے۔ اور الحاد و زندقہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔(۱۳)

سریت اور مذہب :۔

سریت کا اپنا الگ کوئی نظام نہیں' فلسفہ کے ساتھ ربط کے ذریعہ اسے سمجھا جا سکتا ہے یا مذہب سے وابستہ کر کے اسے پہچانا جاتا ہے۔ شاید اس امر سے اختلاف بھی کیا جائے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سریت محض ایک ذریعہ علم ہے یا ایک طریق معرفت اس کا اپنا کوئی الگ مخصوص شعبہ نہیں۔ اس کو ہمیشہ مذہب و فلسفہ کے تعلق سے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

سریت اکثر و بیشتر مذہب کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتی ہے۔ مذہبی و نیم مذہبی عقائد و عبادات میں شدید انہماک کی بناء پر جو کیفیات لوگوں نے محسوس کیں انہیں اسرار دینی قرار دیا گیا۔ یہ ایسے اسرار تھے جو حواس ظاہری کے ادراک سے باہر

www.yabahu.com

تھے ان کیفیات اور واردات یا ان اسرار دینی کے شغف کے ساتھ سریت (مسٹزم) کی ابتداء ہوئی۔ ظاہر ہے کہ سریت کا تعلق بنیادی طور پر مذہب سے ہی ہے۔

مذہب ابتدا میں نبی کے اعلیٰ باطنی وجدان سے ابھر کر سامنے آتا ہے اور نبی اپنی تعلیمات کو اپنے دور کے حالات کے مطابق حتی المقدور ظاہر و باطن کے متوازن نظام کے طور پر پیش کرتا ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں جس نے محض باطن سے سروکار رکھا ہو۔ انبیاء علیہم السلام نے باطن کی روشنی میں ظاہر کو سنوارنے کی کوشش کی۔ ان کا حاسۂ باطنی نور الٰہی سے براہ راست متجلی تھا۔

ایک کثیر الافراد گروہ مذہب کی حدود کے اندر مستقلاً ایسا رہا جو ظاہر پرستی اور قانون کے نفاذ میں سختی اور بعض اوقات سنگدلی کے ردعمل میں مذہب کے باطنی رخ کی طرف مائل رہا۔ یہ بات کسی ایک دین کے ساتھ مخصوص نہیں رہی بلکہ ہر دین کی امت میں سری سلوک کی تحریکیں چلتی رہیں۔ مختلف جماعتیں دین کے باطنی پرت کو ظاہر سے زیادہ اہم خیال کرتی رہیں اور ان سے تعلق رکھنے والے لوگ عقلی استدلالی کی بجائے حاسۂ باطنی کو بنیادی ذریعہ علم و عرفان قرار دیتے رہے۔

ارباب باطن اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام انسانی سطح پر سری احساس اور باطنی احوال کسی ایک قوم یا ایک فرد کی میراث نہیں ہیں۔ ان کے ادنیٰ و اعلیٰ ہونے کے بارے میں تو بات ہو سکتی ہے مگر بنیادی خصوصیات میں وہ مشترک اور ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

کسی مذہب کا پیرو جب سری سلوک اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے مذہب کے مناسک و عبادات سے بے نیاز ہرگز نہیں رہ سکتا بلکہ بعض اوقات ظاہر پرستوں سے کچھ زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ ان کو اپنے عمل میں لاتا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ وہ اس میں توازن قائم رکھ پاتا ہے یا نہیں) ایسا وہ صرف اپنے جذب باطن

کے زیر اثر ہی کر پاتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں اپنے دین کے اندر اپنے نبی کی متابعت میں وہ ان احوال و کشوف کا وارث بنتا ہے جو اس امت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ صاحب حال اپنے تمام باطنی احوال میں اپنے نبی کے تابع ہوتا ہے۔ اس پر وہی احوال و مقامات منکشف ہوتے ہیں جو اس کے نبی کی تعلیمات و عقائد کا لازمی نتیجہ ہیں۔ یوں اس کا مذہب اس کے اسرار روحانی کی تائید کرتا ہے نیز اس کے لئے اس کے نبی کا برتر وجدان معیار یا کسوٹی بن جاتا ہے تاکہ وہ اپنے تجربات کے دوران میں خطا کاری سے بچ سکے۔

کسی مذہب کے سری سلوک کا سالک اپنے دائرے سے باہر اکثر اس لئے نہیں نکل سکتا کہ اپنے مذہب کے محدود عقائد جن پر اس کا شعور کار بند ہوتا ہے اس کے لئے حجاب بن جاتے ہیں۔ اگر حجاب سے پرے کبھی حقیقت عظمیٰ کی کوئی جھلک نظر آتی بھی ہے تو اس کا شعور اس کی تاویل کرتے ہوئے پھر اسے اسی دائرے میں لے آتا ہے چنانچہ وہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے۔

ہر نبی کی اُمّت کے لئے روحانیت میں بھی ایک حد مخصوص ہے اور اس کے پیرو صرف اس صورت میں ہی اسے عبور کر سکتے ہیں جب وہ ارتقاء کے قانون کو ملحوظ رکھتے ہوئے آگے چل کر ایسے نبی کی متابعت کریں جس کے احوال و مقامات نے قدیم امتوں کی مخصوص روحانی منزلوں سے آگے کی نشان دہی کی ہو۔ ہر امت کے سالک کے لئے ایک دائرہ فیض مخصوص ہے۔

ہم عصر صوفی بزرگ خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمتہ اللہ علیہ (۱۴) نے اس فقیر کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا۔ "تمام انبیائے کرام کی امتوں کے بزرگوں کے لئے الگ الگ دائرے مقرر ہیں جہاں جس کا مقام محمود ہو وہاں پہنچ جاتا

www.yabahu.com

ہے ..... مسلمانوں کے علاوہ اور جتنے بھی صاحب کمال روحانی بزرگ ہیں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں وہ زیادہ سے زیادہ "ھو" (کے مقام) تک جا سکتے ہیں۔ عرش تک تو صرف مسلمان پہنچتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے وہاں تک پہنچ کر اپنی امت کے بزرگوں کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے"۔

جس طرح فضیلت کے لحاظ سے انبیاء مراتب میں مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کی امتوں کے روحانیین کے مراتب میں بھی فرق ہے مگر یہ درست ہے کہ اپنی مساعی اور ریاضت کے لحاظ سے وہ جذب دروں کے طفیل اپنے دین کے سری سلوک میں غوطہ زن ہو کر اپنے نبی کے باطنی احوال سے مستفیض ہوتے ہیں یا اپنے معبود کا قرب تلاش کرتے ہیں اور بعض خصائص ظاہری و باطنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ کے ملفوظات میں نقل کیا گیا ہے۔

"آپ (شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ اہل اسلام اور ہندو جوگیوں کا سلوک اخیر تک برابر چلتا ہے۔ وہ سب واردات و حالات و کیفیات جو اہل اسلام کو پیش آتی ہیں ان کو بھی آتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آخر میں اہل اسلام کو اتباع حضرت نبی کریم ﷺ نصیب ہو جاتی ہے' ہندو اس سے محروم رہتے ہیں"۔ (۱۵)

دوسرے مذاہب کا سری سلوک جہاں ختم ہو جاتا ہے وہاں سے اسلام میں تصوف کی ابتداء ہوتی ہے مذکورہ ملفوظ میں گو تاکید نہیں لیکن ارشاد موجود ہے کہ مسلمان صوفی اتباع سنت محمدیہ ﷺ سے سرفراز ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳ ـ ۳۱)

(کہہ دیجئے اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو

چاہے)

یہی محبت و معرفت تمام مذاہب کے سری سلوک اور تصوف کا مطلوب و مقصود ہے۔ دوسرے مذاہب کے سالکین بھی محبت کے دائرے کی کسی قوس تک تو پہنچ جاتے ہیں۔ مگر محبت ذاتی اور اس کے نتیجہ میں اعلیٰ درجہ کی معرفت (معرفت توحید مطلقہ) تو تصوف میں ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ یہی امر دوسرے مذاہب کے سالکین اور صوفیائے کرام کے درمیان حد فاصل ہے۔

سری سلوک کی حدود و قیود :۔

مندرجہ ذیل حوالے کی روشنی میں مزید تشریح کے ساتھ سری سلوک کی حدود و قیود بھی واضح ہو سکتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اپنے طور پر مصنف نے ہر قسم کی سریت (مسٹزم) کے لئے تصوف کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔

"اقوام عالم کے صوفیانہ ادب اور صوفیوں کے اقوال کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے تصوف اس اشتیاق کا نام ہے جو ایک صوفی کے دل و دماغ میں خدا سے ملنے کے لئے اس شدت کے ساتھ موجزن ہوتا ہے کہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آ جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صوفی اسی (خدا) کو اپنا مقصود حیات بنا لیتا ہے"۔(۱۶)

ظاہر ہے کہ ذکر مذہبی سریت کا ہے جس کا اپنی اپنی جگہ پر ہر مذہب سے تعلق ہے اور مقصد اس کا قرب معبود بلکہ خود معبود ہے۔ سریت کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مذہب کے سالکین قرب و معرفت معبود کے حصول کی تگ و دو میں اس مذہب کے لئے مقدر روحانی مقامات تک ضرور پہنچتے رہے لیکن قرآن مجید محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ اعلان سنا دینے کے لئے کہہ رہا ہے کہ اگر ایسا چاہتے ہو تو فاتبعونی یحببکم اللہ (میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے

www.yabahu.com

محبت کرے گا۔) یہاں جو اللہ نے اپنے لئے اسم ذات کے حوالے سے بات کی ہے جو مطلق اسی کے لئے ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اتباع رسول اللہ سے ہی اللہ کی محبت ذاتی اور اس سے متعلق اعلیٰ معرفت کا شرف عطا ہوتا ہے۔ گویا یہ دونوں لازم و ملزوم ہو گئے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کے سالکین کے ہاں دیکھا گیا ہے کہ وہ توحید کا عقیدہ ہو یا محبت الٰہی کا شرف' صفات کی حد تک ہی پہنچ پاتے ہیں۔ جسے تصوف کے روحانی سلوک میں محض توحید صفاتی اور محبت مجازی کہا گیا ہے۔ اسی سے ان کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ذات کی وسعتیں لا محدود ہیں' وہاں محبت ذاتی کی منزلیں بھی لا انتہاء ہیں اور یہی حال تصوف کے سلوک میں معرفت کا ہے چنانچہ دوسرے مذاہب کے سری سلوک کے سالکین بہت نیچے ہی کہیں رک کے رہ جاتے ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر کے اتباع سنت محمدیہ ﷺ کے طفیل اپنی روحانیت و معرفت میں آگے بڑھیں۔(۱۷)

سریت کا اثر :۔

سریت اپنے سالکین کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اور اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں وہ پارسائی اور مقدور بھر معرفت کے طفیل ممتاز نظر آتے ہیں۔ محبت و معرفت کا حال تو ہم نے دیکھا۔ اب اپنے اپنے معاشرے میں ان کے ظاہر کو دیکھئے تو یہ سالکین امت محمدیہ ﷺ کے صوفیاء کرام سے بالکل الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان کے ظاہر سے ان کے باطن کے فرق کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سب سے زیادہ قابل ذکر ان لوگوں کی معاشرتی اور ذاتی اسلوب زندگی کا عدم توازن ہے۔ چونکہ اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں تو مخصوص مقامات محمود تک یہ لوگ پہنچ جاتے ہیں' اس لئے ان کی زندگی کے روحانی پہلو کے خصائص قابل

تحسین نظر آتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید نے نصاریٰ کے راہبوں اور عالموں کی رقت قلبی کے بارے میں تعریف کی ہے کہ جب وہ سنتے ہیں جو کچھ رسول ﷺ پر نازل کیا گیا' تو ان کی آنکھیں پر آب ہو جاتی ہیں اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی۔ ان کے ذوق عبادت اور خشیت الٰہی کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کی فراست و بصیرت کی ایک مثال مباہلہ کے روز ملتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مباہلہ کے روز اہل بیت اطہار حضرت علی' حضرت فاطمہ' حضرت حسنؓ اور حضرت حسین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ساتھ لے کر اسلام کی حقانیت کی قسم کھانے کے لئے میدان میں آئے تو ان میں سے ایک دانا نے کہا۔

"اے گروہ نصاریٰ! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ چاہے کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکا دے تو وہ ان چہروں کی خاطر سرکا دے گا۔ ان سے مباہلہ نہ کرنا ورنہ تباہ و ہلاک ہو جاؤ گے"۔

اسی طرح قرآن مجید نے یہودیوں کے بعض ربیوں کی تعریف کی ہے۔ ہندوستان کے رشیوں اور جوگیوں میں اکثر اپنے قلب سلیم کی بدولت حق کو پہچان کر مسلمان ہوتے رہے اور اگر اپنے مذہب پر ہی قائم رہے تو حق کے منکر نہیں ہوئے۔ بدھ بھکشوؤں نے بھی بہت لوگوں کو اپنے زہد و ریاضت سے متاثر کیا ہے۔ ان تمام مذاہب کے اہل سلوک میں رجحان رہبانیت کی طرف ہے اور معاشرے سے مکمل علیحدگی اور خلقت سے دوامی بعد کی طرف شدید میلان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنے معاشرے کو متاثر کرنے یا اس کی اصلاح کرنے میں اکثر ناکام رہتے ہیں کیونکہ اس کام کے لئے زندگی میں جس اعتدال اور توازن کی ضرورت ہے وہ ان کے ہاں نہیں ملتا۔

سری فلسفہ کے بعض بانیین کی زندگی کے کچھ پہلو تو صوفیاء سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں مگر جو لوگ ان میں سے صرف مادیت یا نفس کی طرف جھک گئے روحانی

www.yabahu.com

طور پر تباہ ہو گئے۔ جس قدر مذہب سے دور ہوتے گئے' یہ بدحالی و بد خصالی بڑھتی گئی۔ ثانوی درجہ پر انہوں نے جو پیرو پیدا کئے تو ان کی حالت مغضوب یا مقہور گروہ کی ہے۔ یہ لوگ نہ دین کے رہے اور نہ دنیا کے۔ ان میں سے اکثر سنکی اور چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ بعض کو نشہ جیسی لغویات میں بھی مبتلا دیکھا گیا۔ کئی خود کشی کر گئے اور آج کے دور میں نمایاں مثال ان ہپیوں Hippies کی ہے۔ جن میں سے اکثر وجودیت Existentionalism کے ملحدانہ فلسفے کی سرپرست سے متاثر ہوئے۔ ان حواس باختہ لوگوں کو دیکھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے

غرضیکہ سرپرست خواہ کسی مذہب کے سلوک سے وابستہ ہو۔ اور خواہ کوئی فلسفے کا نام نہاد مربوط نظام بھی پیش کرنے کا دعوی کرے۔ اس میں فلاح دارین نہیں ہے۔ کسی منسوخ روحانی مذہب سے وابستہ صاحب سلوک تو پھر بھی کہیں نہ کہیں جا پہنچے گا یا کچھ نہ کچھ معرفت کا ادراک کر لے گا۔ مگر ملحدانہ فلسفے کے سری سلوک میں تو یہ بات بھی نہیں ہے۔ وہاں محض ظن و خیال یا گمراہ کن کیفیات کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

دنیا کو ایسے سلوک کی ضرورت ہے جو ظاہر سے بالکل قطع تعلق نہ کرے۔ سالک خواہ روحانیت میں کتنا ہی عروج حاصل کرے' مخلوق میں نزول سے نفور نہ ہو۔ وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی رہے اس کا باطن نہ صرف اسکے اپنے ظاہر کو متاثر کرتا رہے بلکہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہو۔ یہ نمونے صرف اسلام کے سری شعبہ علم و عمل یعنی تصوف میں ملتے ہیں کہ صوفیاء کرام میں ہر پیشے' ہر ہنر اور ہر طبقہ زندگی سے متعلق لوگ رہے جن کی زندگی دوسروں کے لئے اخلاقی' روحانی سطح پر نمونہ کا کام دیتی رہی ہے اور وہ اپنے علم و عمل اور حکمت و معرفت کے طفیل معاشرے میں مربی و معلم کے طور پر بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو میڈونلڈ جیسے متعصب و متشکک مستشرق نے بھی تسلیم کیا ہے۔(۱۸)

صوفی اور سرپرست پسند سالک :۔

سرپرست پسند سالک اور صوفی میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب کا سرپرست پسند سالک عام طور پر اپنے مذہب کے بنیادی عقائد سے قطع تعلق کر کے اپنے ہی تجربات کے پیچھے ہو لے گا۔ بعض اوقات اپنے مذہب کی عبادات کے طور طریقوں کو بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ عصر جدید کے بعض نو مسلم صوفی بزرگ بھی اس الزام سے نہیں بچ سکے۔ وہ اپنے سابقہ علم و عقیدہ کے تناظر کے ساتھ ظاہری عمل میں مشائخ متقدمین کی طرح پابند نظر نہیں آتے۔ طواسین کے انگریز ترجمہ کے دیباچے میں مقدمہ نگار نے اس کوتاہی کا ذکر کیا ہے۔(۱۹) واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن روایت میں رچے ہوئے مسلمان صوفی کا اپنے سلوک میں یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ باطن میں منازل پہ منازل قطع کرتا جاتا ہے اور اس کا ظاہری عمل قرآن و سنت پر اپنی بنیاد استوار رکھتا ہے۔ شریعت کے مطابق عمل اس کے سلوک کی ترقی اور راست روی کا ضامن اور محافظ بن جاتا ہے۔

---☆☆☆---

www.yabahu.com

تصوف

تَصوّف، مخصوص اِسلامی اِصطلاح :۔

اسلام میں سری سلوک تصوف کے نام سے معروف ہوا اور اس سلوک پر چلنے والے کو صوفی کہا گیا ہے۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں کئی آراء ہیں۔ کہا گیا کہ صوفی کا لفظ صفا اور صفہ سے مشتق ہے یا صوف یا صف وغیرہ سے یا پھر کسی عجمی زبان سے لفظ "صوفی" بنا لیا گیا۔ ترجیح اس قول کو دی گئی ہے کہ چونکہ ابتداء میں زاہد و مرتاض لوگ صوف یا اون کے کپڑے پہنتے تھے' اس لئے ان کو صوفی اور ان کے سلوک کو تصوف کہا جانے لگا۔ لغوی معنوں اور تاریخی پس منظر کے بارے میں تحقیق متعلقہ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تصوف کی اصطلاح علوم دین اسلامی میں سلوک باطنی کے لئے مخصوص ہے اس لئے تصوف کے ساتھ جو بعض اوقات اسلامی کی صفت لگا دی جاتی ہے۔ محض وضاحت برائے وضاحت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح انگریزی میں "اسلامک صوفی ازم" میں اسلامک کا لفظ زائد ہے کیونکہ صوفی ازم بجائے خود تصوف کے مترادف ہے اور اسلام سے خاص ہے۔

باطن کی اَوّلیّت و اہمیّت :۔

بہت کم لوگ غور کرتے ہیں کہ دین جب ظاہر ہوتا ہے تو اس کا رخ باطن

سے ظاہر کی طرف ہوتا ہے۔ نبی کے باطن پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس کا مخاطب بھی انسانوں کو باطن ہوتا ہے' جسے ہم فطرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی فطرت کے اندر سے ظاہر کی اصلاح کی تمنا پیدا ہوتی ہے چنانچہ ربّیت اور باطنیّت تو ابتداء میں ہی مذہب کے اندر موجود ہوتی ہے' اس کو بعد میں بدع نہیں کیا جاتا۔ چونکہ بعد ازاں مذہب ظاہر کی سطح پر اصلاح و درستی کے قوانین نافذ کرتا ہے اس لئے سطحی نظر سے مطالعہ کرنے والے مذہب کو اولاً" بھی ظاہر سے ہی متعلق خیال کرنے لگتے ہیں۔

علم دین کی پہلی سطح باطن ہے اور دوسری سطح ظاہر۔ دین میں باطن کی اہمیت اور اس کی تاکید کے باوجود ظاہر پرستوں نے ظاہر کو ہی سب کچھ سمجھ لیا تو اس سے حقیقت حال نہیں بدل جاتی۔ عبادات و معاملات میں اخلاص فی العمل کے لئے ضروری ہے کہ باطن کی اہمیت و اولیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق ظاہر کی تہذیب کی جائے۔ یہی تصوف کی تعلیم ہے۔ اس میں ظاہر کی درستی کو نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ صرف اس کا محل متعین کر دیا گیا ہے۔ یہی توازن علم و عمل تصوف کا طرح امتیاز ہے۔

ماخذ :۔

تصوف کے ماخذ قرآن و سنت ہیں۔ جیسا کہ متعدد محققین حوالوں سے ثابت کر چکے ہیں' ان ماخذ کو کہیں باہر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجموعی طور پر انسانی فطرت کو مخاطب کرتا ہے جس کا گو ایک ظاہری پہلو بھی ہے' لیکن بصیرت جو حق کو پہچان کر انسان کو یقین کے درجے تک پہنچاتی ہے' فطرت کے باطن سے ہی روشنی حاصل کرتی ہے۔ اللہ اپنے قرب و معیت کے بارے میں انسان کو اپنے اندر یقین و ایمان پیدا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کی روشن آیات آفاق و انفس دونوں میں دعوت فکر و نظارہ دے رہی ہیں۔ وہ نظر جو اسرار و قدرت الٰہی کے

www.yabahu.com

بارے میں علم و یقین عطا کرتی ہے صرف تصوف کے لائحہ عمل پر کاربند ہونے سے ہی ملتی ہے۔

قرآن مجید کی ان چند آیات پر غور کرنے سے تصوف کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ھوالاول و الاخر و الظاھر و الباطن وھو بکل شئی علیم (۵۷ ـ ۳)

وہ ہے پہلا اور پچھلا اور باہر اور اندر اور وہ سب چیز جانتا ہے۔

وھو معکم اینما کنتم (۵۷ـ۴)

اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔

نحن اقرب من حبل الورید (۵۰ ـ ۱۶)

اور ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ۔

واذ کر اللّٰہ کثیرا لعلکم تفلحون (۸ ـ ۴۵)

اور اللہ کو بہت یاد کرو۔ شاید تم مراد پاؤ۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللّٰہ (۴۸ ـ ۱)

اور جو لوگ تجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ (بیعت کرتے ہیں) وہ اللہ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔

و فی الارض آیات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون (۵۱ ـ ۲)

اور یقین لانے والوں کو زمین میں نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر، کیا تم کو سوجھ نہیں؟

سنریھم ایتنا فی الافاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق ط اولم یکف بربک انہ علی کل شیئی شھید (۴۱ ـ ۵۳)

اب ہم ان کو اپنے نمونے دنیا میں دکھا دیں گے۔ اور آپ ان کی جان میں جب تک کہ ان پر کھل جاوے کہ یہ ٹھیک ہے۔

اسی طرح اور بہت سی آیات بھی موضوع سے متعلقہ کتب میں نقل کی گئی ہیں۔ توحید کے بارے میں یقین، ذکر کثیر اور بیعت کے علاوہ روحانی تجربات (اپنی ذات میں آیات کا مشاہدہ) یہ سب امور تصوف کے نظریہ و عمل کے موید ہیں۔

روحانی تجربات کے بارے میں صوفیاء نے بہت احتیاط برتی ہے اور وہ بجا ہے لیکن کسی نے سالک کے لئے ان کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا ہے۔ مکاشفات سے اسرار الٰہی کھلتے ہیں اور ان سے سالک کا یقین بڑھتا ہے۔ اسرار تکوینی ظاہر ہوتے ہیں تو اس سے دنیاوی امور میں الٰہی مصلحتیں ظاہر ہوتی ہیں اور اس سے اللہ کے حکیم و خبیر ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ سلوک ایک انضباطی عمل ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک خود و خدا آگاہ مرد کی زیر نگرانی عزم و استقلال کے ساتھ یہ عمل جاری رکھا جائے۔

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کی تربیت میں ہمیشہ باطن کے عمل کو پیش نظر رکھتے تھے۔ آپ کا طریقہ تھا کہ صبح سویرے نماز کے معاً بعد اصحاب سے رویاء سنتے اور ان کی تعبیر ارشاد فرماتے تھے۔ اپنے ساتھوں سے ان کی روحانی کیفیات کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان کی تاویل و تعبیر بیان فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے ابتدائی زمانے کے ساتھیوں کے لئے شواہد نبوت تو یہی معجزات، کشوف، اخبار غیب اور رویاء ہی تھے۔ فتح و کامیابی سے متاثر ہونے والے تو بعد کے لوگ تھے۔ سابقون الاولون نے تو رسول اللہ ﷺ کی عظیم روحانی شخصیت، علم لدنی اور برکات و معجزات کو دیکھ کر ہی اپنے اسلام و ایمان کو احسان کے درجے تک پہنچایا تھا۔

محض تزکیۂ نفس نہیں :۔

کچھ حضرات جن کی نظر جدید دور میں اسلام کی عمرانی تعمیر تک ہی جا کر ٹھہر جاتی ہے، تصوف کو محض تزکیہ نفس تک محدود قرار دیتے ہیں۔ یوں وہ عام

www.yabahu.com

مسلمانوں کو شاید یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ تصوف کے مخالف نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ نفس تو اسلامی تعلیمات کی پہلی ہدایت ہے۔ اگر آدمی بری عادات سے توبہ کر کے نیکیوں کی عادت نہ ڈالے یا اپنے اخلاق کو نہ سنوارے تو اس نے ابتدائی شرط ہی پوری نہ کی۔ تصوف تو روحانی کیفیات اور روحانی مدارج اور ان کی ترقیات سے متعلق ہے۔ یہ محض ضابطۂ اخلاق نہیں ہے۔ یہاں معاملہ نفس کے تزکیہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے بعد تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کام بھی باقی ہے اور پھر روحانی تجربات و ترقیات کی کوئی انتہا نہیں۔ جب مرد راہ کا باطن اس کا ظاہر یا ظاہر اس کے باطن کی علامت بن جاتا ہے تو تب وہ کہیں احسان کے درجے تک پہنچتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب وہ کل یوم ھوفی شان کی تجلیات سے آگاہ ہو کر اسرار الٰہی کی معرفت حاصل کرتا ہے اور عشق کے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ اکتسابی علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

مَرا بہ ہیچ کتابے مکُن حوالہ دِگر
کہ مَن حقیقتِ خُود را کتاب می بینم

(مجھے اب کسی اور کتاب کے حوالے مت کر کیونکہ میں اب اپنی حقیقت کو کتاب دیکھتا ہوں۔ یعنی اپنی باطنی حقیقت کے مطالعہ سے علم حاصل کر رہا ہوں)

اگر ضابطہ اخلاق پر ہی اصرار ہے تو تصوف کا پھر اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہے۔ جس کی رو سے آدمی ہر وقت اپنے دل کی کیفیات پر نگران رہتا ہے۔ جسے مراقبہ کہتے ہیں اور مراقبہ کا مقصد صرف یہی نہیں ہے' بلکہ یہ ایک مستقل عمل ہے جس میں آدمی غفلت سے بچ کر ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ خواہ وہ بظاہر کسی کام میں مصروف ہو۔ ہر آن اپنا محاسبہ کرتا ہے کہ کہیں غفلت تو نہیں ہوئی؟ کہیں نظر چوکی تو نہیں؟ کہیں حق نظروں سے اوجھل تو نہیں ہو گیا؟ اور پھر ضابطہ اخلاق میں صرف لکھی یا بتائی ہوئی نصائح کافی نہیں ہوتیں۔ ایک مرد دانا و آگاہ کے زیر تربیت

رہ کر ہی یہ اور سلوک روحانی کے دوسرے عمل جاری رکھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ تصوف کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں یا تو اسلامی علوم پر ان کی نظر سطحی ہے اور یا پھر وہ تزکیۂ نفس کا نام لے کر لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ تصوف بس یہی کچھ ہے اور اس کے وہ بھی قائل ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

محض دینی نفسیات بھی نہیں :۔

اسی طرح بھی کہا جاتا ہے کہ تصوف نفسیات دینی کا نام ہے۔ حالانکہ تصوف میں نفس سے متعلق امور تو محض ابتداء کی باتیں ہیں مثلاً" توبہ ایک نفسیاتی حالت ہے جب آدمی کسی حادثے یا بحران یا کسی مخصوص ذہنی حالت میں اپنی پچھلی زندگی کی کرتوتوں کو رد کرتا ہے۔ اور ان کی بجائے نیکیوں کو اپنانے کا عہد کرتا ہے تو اسے توبہ کہتے ہیں۔ اب یہ بات محض نفس امارہ سے متعلق ہے۔ پھر ایک مسلمان نیت کو درست کر کے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے فرق کے ساتھ معاملات زندگی سر انجام دیتا ہے۔ یہ نفس لوامہ ہوا۔ آخر میں جب وہ اپنے نفس کو سنوار لیتا ہے تو نفس مطمئنہ کی کیفیت کو پا لیتا ہے۔ لیکن روحانی ترقی تو صحیح معنوں میں نفس مطمئنہ سے شروع ہوتی ہے۔ گو اس سے پہلے کی حالتیں بھی تصوف کی مبادیات میں ہی گنی جائیں گی مگر تصوف کا اصل مقصود تو نفس کی انتہا یعنی اس کے قبول تقویٰ سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں نفس کی نفسیات ختم ہو جاتی ہے۔ آگے جو کیفیات اور واردات پیش آتی ہیں یا جن احوال و مقامات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کے لئے نفسیات کا لفظ سخت غیر موزوں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک مقام سے تو وہ عالم شروع ہوتا ہے کہ زبان اس کے فہم اور اس کی ترجمانی سے عجز کا اظہار کرتی ہے۔ ذکر و فکر اور نوافل اور عبادات و ریاضت کے ساتھ ہی واردات شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر قرب و معرفت کے مرحلے آتے ہیں اور یقین کا وہ درجہ بھی آتا ہے جسے کوئی نفسیات کی اصطلاح بیان نہیں کر پاتی۔ ان سب کے لئے دینی نفسیات

کی ترکیب لفظی کا استعمال فریب خوردگی یا فریب دہی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ نظر شے کی حقیقت کو نہ دیکھنے کی عادی ہو جائے تو انجام یہی ہوتا ہے۔

حکمتِ الٰہیہ :۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے تصوف کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دین اسلامی کی ہی باطنی پرت ہے۔ اسی طرح جدید دور کے ایک مسلمان عالم نے بھی کہا ہے:

"روحانی سلوک کا طریقہ جسے عموماً" تصوف کہا جاتا ہے اسلام کی ہی ایک داخلی اور باطنی جہت ہے اور شریعت کی طرح قرآن و سنت میں اس کے اصول موجود ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے دل کی حیثیت سے یہ جسمانی دل کی مانند ظاہری نظروں سے اوجھل رہتا ہے اگرچہ دل کی مانند ہی یہ حیات کا سرچشمہ ہے اور ایسا مرکز ہے جو اسلام کے تمام جسد دینی کو داخلی طور پر منظم رکھتا ہے"۔ (۲۰)

دین کی قبولیت کی پہلی شرط یہ قرار پاتی ہے کہ خدا کو ایک مانو' اس کے فرشتوں کو مانو' پیغمبروں اور ان کی کتابوں کو مانو اور جان لو کہ قیامت آئے گی۔ اور سزا و جزا کے لئے جنت و دوزخ میں جانا ہو گا۔ اسے ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ جو ہمارے باطن سے متعلق ہے کیونکہ اس غیب کی تصدیق قلب (باطن) کے ذریعے سے بنیادی شرط ہے۔ پھر ایمان کوئی جمود کی حالت ہرگز نہیں۔ اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور یہ بڑھتا ہے لہٰذا اس تصدیق کو حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچانا بھی ایمان کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ تصوف اس باطن کی تعمیر کا نام ہے جو ان سب مقاصد پر محیط ہو چنانچہ اس کو حکمتِ الٰہیہ نیز روح اسلام یا قلب اسلام بھی کہا گیا ہے۔

حضرت سلطان باھو قدس اللہ سرہ' نے ایک موقعہ پر اس حکمت کے چار ارتقائی مراتب بیان فرمائے ہیں:۔

"رُسید و دید و یافت و شناخت"

پہلا مرتبہ رسید کا ہے کہ اللہ کو ایک مان لیا۔ دوسرا مرتبہ دید ہے یعنی مشاہدہ قرب حضور' تیسرا درجہ یافت ٹھہرا یعنی جمعیتِ کُل حاصل ہو گئی۔ اور چوتھا مرتبہ شناخت ہے کہ فقیر اپنے نفس کو فنا سے اور اپنے پروردگار کو بقا سے سمجھا اور حقیقت کی معرفت حاصل ہو گئی۔(۲۱)

ان مقاصد کے حصول کے لئے عشق کا جذبہ قوت عطا کرتا ہے۔ اگر تڑپ نہ ہو تو آدمی اس مقام تک ہرگز نہیں پہنچ پاتا' جہاں غیب شہود میں بدل جاتا ہے یا شنید دید بن جاتی ہے اور یقین حق الیقین کا درجہ پا لیتا ہے غرضیکہ غیب کے علم کو شہودی طور پر جاننے اور اللہ کی ذات میں فنا ہو کر بقاء حاصل کرنے اور ان مقاصد کو پا لینے کے لئے مخصوص طریقوں پر چلنے کا نام تصوف ہے۔

اس دور میں جو دینی نظریات و عقائد میں تشکیک کا مرض پیدا ہو گیا ہے' اس کا علاج صرف اس حکمت میں ہے جو اللہ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے' اور یہ حکمت صرف ان پر منکشف ہوتی ہے جو خلوص کے ساتھ کسی ولی اللہ کی خدمت میں اس غرض کے لئے حاضر ہوتے ہیں کیونکہ اس کے لئے کسی ایسے بزرگ کی صحبت و تربیت ضروری ہے جس کا سینہ اسرار حکمتِ الٰہیہ کا خزینہ بن چکا ہو۔

رُوحانی تجربات :۔

سابقہ ادوار میں صوفیاء کرام روحانی تجربات کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق کم ہمت سالکین کے لئے روحانی تجربات کی دلچسپیوں میں کھو کر رہ جانے کا خدشہ تھا اور ایسا ہونے کی صورت میں روحانی ترقی رک جاتی ہے

www.yabahu.com

جو سالک کے لئے خطرہ عظیم ہے۔ یہ خطرہ اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے' لیکن اس کے باوجود روحانی تجربات کے بغیر اس وقت کوئی چارہ تھا' نہ اب ہے۔ انہی روحانی تجربات کے ذریعہ سے یقین بڑھتا ہے اور انہی سے روحانی ترقی کی منازل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حارث بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آج صبح کس حال میں ہوئی؟ انہوں نے کہا "اس حال میں کہ میں پکا مومن ہوں۔" فرمایا "کیا دیکھتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا "میں نے نفس کو دنیا سے ہٹا لیا۔ اس کو بھوکا رکھا' راتوں کو بیدار رہا' یہاں تک کہ میری باطنی نظر اس وقت ایسی تیز ہے گویا عرش رحمان' جنت و اہل جنت اور دوزخ و اہل نار کو سامنے دیکھ رہا ہوں۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے تیرے دل کو اپنے نور سے منور کر دیا ہے۔ پس اس معرفت و بصیرت کو قائم رکھ یعنی ان کی حفاظت کر' تجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو کہ یہ حالت ضائع ہو جائے۔

مشائخ اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے زیر تربیت سالکین سے ان کے رویاء و کشوف سنتے ہیں اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ تجربات امور تکوینی سے بھی متعلق ہوتے ہیں یعنی دنیاوی کاموں کے بارے میں بعض انکشافات ہوتے ہیں اور روحانی اسرار بھی سالک پر کھلتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ایک تو یقین بڑھتا ہے اور دوسرے علم ظاہر سے آگے مشاہدے کے درجے میں آ جاتا ہے کیونکہ صرف ظاہر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ الاکبر رحمتہ اللہ علیہ نے "فصوص الحکم" میں نص غیب میں فرمایا ہے کہ علم ذوقی و شہودی ہی علم صحیح ہے اور جو علم اس کے سوا ہیں وہ محض گمان کی باتیں اور تخمینہ ہیں۔

روحانی تجربات کی روشنی میں سالک پر علم باطن یا علم غیب منکشف ہوتا

ہے۔ وہ ساری باتیں جو سالک نے ظاہر میں مانی تھیں اب باطن میں انہیں دیکھ لیتا ہے۔ یہ دید محض کوئی سکونی کیفیت نہیں بخشتی بلکہ اس دید کے ساتھ بے پناہ حرکی قوت ہوتی ہے۔ جو سالک کے علمی و عملی قویٰ کو بے حد ذکاوت عطا کر دیتی ہے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ جیسا معتبر عالم اور متکلم بھی اندیشوں سے گھبرا کر روحانی تجربات کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ بالآخر گیارہ سال کی ریاضت و عزلت کے بعد ان کا علم مشاہدے کے درجے تک پہنچا اور پھر انہوں نے فرمایا کہ نبوت کا علم بطور ذوق کے مشاہدہ کا حکم رکھتا ہے گویا اس کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور اس قسم کا علم و یقین سوائے طریق صوفیائے کرام کے حاصل نہیں ہوتا۔

رُوحانی تجربات کا تنوّع :۔

عام طور پر جدید دور کے خرد پسند روحانی تجربات پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ روحانی تجربات سے کوئی متفقہ و مسلمہ نتائج حاصل نہیں ہوتے جنہیں اصولوں کا درجہ دیا جائے مگر یہ اعتراض تصوف کو بہت ہی سطحی نظر سے دیکھنے والوں کی طرف سے ہوتا ہے کیونکہ خود خرد پسندی کے داعین یا بانیین ہی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ سریت اور تصوف سے بھی کچھ مسلمہ اصول صادر ہوتے ہیں جو اپنی جگہ پہ روحانی تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ولیم جیمز' برٹرینڈ رسل اور ہاکنگ کی آراء ابتدائی ابواب میں نقل کی جا چکی ہیں۔ در اصل یہ اعتراض اس لئے پیدا ہوا کہ جیسے ہر فرد کی طبیعت اور استعداد جدا ہوتی ہے اسی طرح ہر آدمی کی روحانی کیفیت بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور منفرد ہوتی ہے مگر چونکہ حقیقت ایک ہے اس لئے یہ تجربات اسی حقیقت واحدہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جو ان تجربات و مشاہدات کا منتہائے مقصود ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

و فی الارض قطع متجورات و جنت من اعناب و زرع و نخیل صنوان و غیر صنوان یسقٰی بماء واحد و نفضل بعضہا علٰی بعض فی الا کل ط ان فی

www.yabahu.com

ذا لک لایت لقوم یعقلون (۱۳ ـ ۴) اور زمین میں کئی کھیت ہیں ملے ہوئے اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتی جڑ ملی اور بن ملی' ایک پانی پاتے ہیں اور ہم میوے میں ایک سے ایک کو زیادہ کرتے ہیں۔ اس میں ان کو نشانیاں ہیں جو بوجھتے ہیں۔

اسی طرح فرمایا: انزل من السماء ماء فسالت اود یتہ بقدر ھا (۱۳ ـ ۱۷) آسمان سے پانی اتارا پھر اپنے انداز کے ساتھ نالے بہے۔ ان آیات کی تعبیر و تفسیر کی رو سے اسی طرح انسانوں کی طبائع' ان کے ذہن اور ان کی روحانی استعداد مختلف ہے مگر چونکہ ان کے قلوب ایک ہی نور سے منور ہوتے ہیں' اس لئے اہل نظر کو روحانی تجربات کے اس تنوع اور کثرت میں بھی وحدت دکھائی دیتی ہے چنانچہ سریت کے درجہ پر بھی اسی لئے لوگوں نے اس کو ایک مربوط فکر کہا ہے۔

یاد رہے کہ یہ اعتراض آج کے خرد پسندوں کو ہی پہلی بار نہیں سوجھا۔ روحانی تجربات کے تنوع کا مسئلہ صوفیاء کرام کے پیش نظر رہا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک یہ ایک ایسی ہی بات تھی۔ گویا علامتیں یا استعارے مختلف ہوں مگر حقیقت ایک بیان کی جا رہی ہو۔ مولانا حسین بن حسن سبزواری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "جواہر الاسرار" (در شرح مثنوی مولانا روم) میں ایک پوری فصل اس کے بیان میں لکھی ہے۔ انہوں نے کہا ہے:

"بے شک اصحاب حال کے اشارے اور ارباب کمال کی عبارتیں حقیقت ذات کے کشف میں استعداد کے اختلاف کی بناء پر مختلف واقع ہوئی ہیں۔ استعداد کا یہ اختلاف گویا طریقوں' صورتوں اور صفائی یا عدم صفائی کی مانند ہے اور ہر عارف نے اس کے لئے کوئی الگ نشانی دی ہے اور ہر دیکھنے والے نے کوئی دوسرا نام رکھ دیا ہے۔ ..... یہ اختلاف الفاظ میں ہے' معانی میں نہیں جس طرح سالکین کا سلوک ظاہری روش میں ہوتا ہے توجہ روحانی میں نہیں۔ اسی طرح اختلاف مظاہر کی صورتوں میں

تو ظاہر ہے لیکن اس حقیقتہ الحقائق میں نہیں جو مظاہر میں نمایاں ہے"۔(۲۲)

رُوحانی تجربات اور مختلف طریقے :۔

تصوف میں سلوک روحانی تربیت کا نصاب ہے۔ ظواہر دین یعنی فقہ' حدیث اور تفسیر وغیرہ کی تعلیم کے بعد سالکین اس کے مطابق تربیت حاصل کرتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ بہت ہی ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ مشائخ طریقت میں یہ بات پائی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر نے دس برس سے بھی کم عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور پندرہ برس کی عمر میں علوم متداولہ میں تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ تصوف اور اس کے سلوک کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ ان کے ذہنی و روحانی ارتقاء کی دلیل تھی۔ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ اولیاء اللہ ظاہری علوم سے بے بہرہ رہے یا متوسط قسم کی تعلیم پا کر سلوک میں تربیت پاتے رہے۔ ان پر بھی خدا کا یہ فضل ہوا کہ ان کا نور بصیرت انہیں شرعی احکام کی پاسداری سے بے بہرہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چونکہ لوگ طبائع اور استعداد میں مختلف ہیں۔ اس لئے ان کے نصاب بھی مختلف ہو گئے سلوک کے مختلف طریقے دراصل نہ صرف مختلف ہم طبع وہم لیاقت لوگوں کی تربیت کے لئے الگ الگ جاری ہوئے بلکہ ان کے اجراء و نفاذ میں زمانے کے تقاضوں کا دخل بھی تھا۔ جن کا ذکر آگے آتا ہے اس لئے سلوک میں ایک کی دوسرے پر فضیلت کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ نتیجہ و انجام کے لحاظ سے آخر میں سب ایک ہو جاتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں کہ ایک شخص کسی بزرگ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوا مگر انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ تمہارا حصہ یا نصیبہ یہاں نہیں ہے تم فلاں بزرگ کے پاس جا کر فیض پاؤ۔ یہ کسی اور کے پاس بھیجنا اس لئے تھا کہ اس کی تربیت دوسری جگہ اس کے مزاج اور اہلیت و استعداد

www.yabahu.com

کے مطابق بہتر طور پر سرانجام پا سکتی تھی۔

پھر اپنے اپنے طریقے میں سالکین کے سلوک اور روحانی تجربات کی نوعیت عام طور پر ایک جیسی ہوتی ہے مثلاً" نقشبندی سلوک میں جسم میں شعور کے چھ مراکز (لطائف ستہ) پر توجہ کرا کر مختلف انوار کی سیر کراتے ہوئے سالک کو آگے لے جاتے ہیں۔

چشتیہ سلوک میں ذکر' سماع اور دیگر ریاضتوں سے گزار کر رہنمائی کرتے ہیں بعض مشائخ نے طویل عرصے کی تربیت کے لئے منازل مقرر کیں۔ جیسے وحشت' غیرت' شہوت اور حیرت کی منزلیں۔ آزمائش اور امتحان کے بعد سالک ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ خلفاء کے لئے تربیت کا یہ عرصہ کئی سالوں پہ محیط ہوتا ہے۔ کبھی مرشد مرید کو چار درجوں سے گزار کر حقیقت کے مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے' پہلا درجہ ناسوت ہے۔ ناسوت سے مراد یہ دنیا ہے۔ اس میں شریعت پر مکمل عمل کے بعد سالک اگلے مرتبہ ملکوت کی طرف بڑھتا ہے۔ یہاں فرشتوں جیسے خصائل یعنی طہارت' عبادت اور پارسائی میں پختگی حاصل کی جاتی ہے۔ اگلا مرتبہ جبروت ہے جس میں قوت و معرفت عطا ہوتی ہے۔ اور چوتھا مرتبہ لاھوت ہے' یہاں سالک میں الٰہی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں یا وہ الٰہی اخلاق میں جذب ہو جاتا ہے اور حقیقت کو پا لیتا ہے۔ قدماء میں سے بعض نے چار مراحل تجویز کئے ہیں جیسے:

اول: سفر اللہ۔ یعنی بندے کا گناہوں سے توبہ کے بعد علم اور عبادت میں مصروف ہو جانا۔

دوم: سفر الی اللہ۔ یعنی بندے کا اس اسم کی معرفت حاصل کرنا جو اس کا رب ہے یا جس کا وہ مظہر ہے۔ یہ معرفت متعلقہ اسم کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

سوم: سفر باللہ۔ یہ عروج کے بعد نزول کا مقام ہے۔ جب سالک الٰہی صفات سے متصف ہو کر تدریس و تبلیغ میں مصروف ہوتا یا اپنے طریقے کا فیض دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔

چہارم: سفر فی اللہ۔ یہ بقا کا مقام ہے یعنی اپنے متعلقہ اسم اور اس کی صفات میں استقامت۔ یہ اس بندے کا گویا مقام محمود ہے جو اس کے لئے ازل سے مقدر تھا۔ (۲۳)

شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے تمام تعینات و تنزلات یا کثرت سے گزر کر وحدت واحدیت تک پہنچنے کا سلوک پیش کیا ہے۔ اس کے لئے بھی الگ اذکار اور مراقبات ہیں۔

غرضیکہ طُرق کے بانی مشائخ کبار کے ہاں نصاب میں یہ اختلاف ضرور ملتا ہے اسی طرح ہر طریقے کی دعائیں' اذکار اور اوراد و وظائف بھی مخصوص ہیں (ادعیتہ الرسول ﷺ یا ادعیتہ القرآن سب میں عام ہیں البتہ تربیت ان کی بھی مختلف ہو سکتی ہے۔) ان اوراد و وظائف کے ثمرات متعلقہ طریقوں کے نتائج تعلیم کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ مبتدی کو اپنے شیخ کی مرضی کے بغیر کسی اور ورد یا وظیفے میں دلچسپی نہ لینی چاہیے کہ اس طریقے کے مخصوص ذوق کی تشکیل میں یہ حارج بھی ہو سکتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ظرف علم میں بہت کشاد ہوتی ہے یا عشق میں وارفتگی کی حدود کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ وہ پھر کسی ایک طریقے کے پابند نہیں رہتے۔ ان کا اخلاص اور ان کا شوق انہیں ہر چشمے پر لے جاتا ہے۔ اور وہ ہر گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ انہیں تصوف میں عام طور پر قلندر کہا جاتا ہے۔ اپنے اپنے سلوک کا ہر منتہی بھی ایک لحاظ سے قلندر ہو جاتا ہے کہ اب وہ دوسرے طرق کے سلوک سے فیض یاب ہونے میں آزاد ہوتا ہے۔

www.yabahu.com

کوئی بھی سلوک ہو اس کا منتہائے مقصود قرب و رؤیت الٰہی ہے۔ جب سالک انوار الٰہی کو دیکھتا ہے تو زبان ان کے بیان سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اس وقت اس پر صحیح معنوں میں نبی کے علم کی حقیقت کھلتی ہے۔

عصرِ جدید میں ترمیمِ سلوک کی ضرورت :۔

اس موقعہ پر زمانے کے حالات کے مطابق سلوک میں تبدیلی کی طرف اشارۃً ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ طرق میں اختلاف لوگوں کی استعداد اور زمانے کی مقتضیات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں بھی مشائخ نے سب سے زیادہ عملی سلوک میں نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ہے کیونکہ شرعی احکام کی صورتوں کو استحکام کا شرف حاصل ہوتا ہے لیکن تصوف کے عملی شعبہ میں ضرورت اور حالات کے تحت ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کی مثال علم طب کی سی ہے۔ جس کی غرض و غایت یا افادیت انسان کی صحت و تندرستی ہے مگر نئی نئی بیماریوں اور دواؤں کی ایجاد و دریافت کی بنا پر علاج و پرہیز کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تصوف میں مقصد محبت و معرفت الٰہی ہے مگر اس کے حصول کے لئے مشائخ اپنے اپنے علم اور اجتہاد کی بدولت وقتاً فوقتاً سلوک میں ترمیم کو لازم جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حالات بہت بدل گئے ہیں۔ زمانے کے تقاضے اور ہیں اور اس کے ساتھ لوگوں کی طبائع اور استعداد میں بھی فرق آگیا ہے' اس لئے سلوک بھی ان کے مناسب حال ہونا چاہیے۔ صوفیاء کرام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر زمانے میں ایسا ہوتا رہا ہے جیسے ابتدائی دور میں قلوب پر خشیت الٰہی کا تسلط زیادہ تھا' تو محض ریاضات شاقہ اور مجاہدہ کو اہمیت دی جاتی تھی۔ بعد ازاں امام غزالی' شیخ شہاب الدین سہروردی' اور شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی رحمتہ اللہ علیہم نے علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے۔ ان کی

تحصیل ضروری قرار پائی۔ یہ گویا تصوف میں فکر و ادراک کا دور تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رحمتہ اللہ علیہ نے جذبے کو سلوک پر مقدم کیا تاکہ سالک کے لئے آسانی کی راہ پیدا ہو۔

ہندوستان میں سماع کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء نے اہل ہند کے مزاج کا رخ بدلا اور سلوک میں سوز و ساز اور ذوق و شوق کا رنگ گہرا کر دیا۔ زمانے کے تقاضے بدلے تو مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے تمام ذوق و شوق کو باطن کی طرف مائل کرنے کی تعلیم دی۔ آپ نے لطائف ستہ میں لطیفۂ قلب سے ابتدا کی اور مراقبات کے ذریعہ دوائر کی سیر کرا کے سلوک کی تکمیل کرائی۔ ظاہر ہے کہ صوفیاء اپنے اپنے طرق میں کبھی پہلے متشدد رہے ہیں نہ اب ہیں۔ عصر جدید میں لوگوں کی چال ڈھال' رہن سہن اور فکر و احساس کے طریقوں اور رویوں میں اس قدر انقلاب آیا ہے کہ ارباب علم و معرفت کو تعلیم و تلقین کے طریقے بدلنے پڑ گئے اور محفل تصوف بھی ان حضرات سے خالی ہونے لگی جو پرانے طریقوں کا عالم و عامل یا معلم و مربی تھے۔ اس صدی کے شروع سالوں میں مولوی محمد حسن بجنوری نے مشائخ نقشبندیہ مجددیہ کے ضخیم تذکرہ کے آخر میں طریقہ کے مراقبات اور سیر دوائر کے بیان کے بعد لکھا تھا:

"۔۔۔۔ مگر واضح ہو کہ ان مقامات عالیہ پر بلا توجہ پیر کامل مکمل کہ جس نے تفصیلاً (یہ مقامات) حاصل نہ کئے ہوں پہنچنا محال ہے۔ اور افسوس کہ اس وقت ایسے بزرگوار النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں اور جو شاذ و نادر تھے۔ ان سے بھی زمانہ روز بروز خالی ہوتا جاتا ہے۔ اور قریب ہے کہ تسلیک مقامات مجددیہ مسدود ہو جائے۔" (۲۴)

یہ خدشہ اس لئے باعث تشویش تھا کہ حالات و واقعات زمانے کی طبیعت میں تغیر بپا کر چکے تھے اور اب تصوف کے دائرے میں بھی تبدیلی کی ضرورت تھی۔

www.yabahu.com

خدشات تو اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی بھی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے۔ تو اس کی رحمت کئی دوسرے دروازے کھول دیتی ہے۔ غرض و غائت اللہ کی محبت و معرفت میں کمال ہے خواہ وہ اپنی حدود میں کسی طرح سے اور کسی طریق سے حاصل ہو۔

اب اس صدی کے اختتام تک تو حالات بالکل بدل چکے ہیں لیکن صوفیاء کرام نے سلوک میں تبدیلیوں کی ضرورت پہلے سے محسوس کر لی تھی۔ چنانچہ عرصہ ہوا کہ مشائخ کرام نے اپنے سلوک کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کی طرح ڈال دی تھی۔ انہوں نے طویل مراقبات اور اوراد کثیر کو خارج کر کے صرف ان دعاؤں اور مراقبوں کو باقی رکھا۔ جو سلوک کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ فرصت قلیل ہو گئی ہے علم کی کثرت ہے اور لوگوں میں تذبذب، تشکیک اور بد عقیدگی کا دور دورہ ہے اس لئے انہوں نے ایسی راہ اختیار کی۔ جس سے مقصود تک رسائی اور یافت میں آسانی ہو۔

جدید دور میں مشائخ کا طریقِ عمل :۔

فقیر نے دیکھا ہے کہ اس دور کے مشائخ کرام خواہ وہ کسی بھی روایتی طریق کے متوسلین میں سے ہوں عام طور پر ایک سا طریقہ تعلیم و تلقین استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً" صاحب وقت اور باہمت مشائخ سب سے پہلے توجہ کے ذریعے طالب کے اندر جذبہ کو بیدار کرتے ہیں۔ جذبہ کے ساتھ ادراک کا حاسۂ باطنی بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ سالک روحانی تجربات سے مستفیض ہوتا ہے۔ تشکیک دور ہونے لگتی ہے۔ معرفت کے لئے فہم کھل جاتا ہے اور اس دوران میں صرف وہی اذکار و اوراد تلقین کئے جاتے ہیں جو احوال و کیفیات میں استقامت کے لئے مُمد مُعاون ہوتے ہیں۔ اگر مراقبات تجویز کئے جاتے ہیں تو وہ بہت سادہ اور آسان ہوتے ہیں کہ ان سے کشف کے لئے راہ کھلتی ہے اور تشکیک سے نجات ملتی ہے۔

اس دور میں علم کی بڑی کثرت ہے مگر علم میں بے راہ روی بھی اتنی ہی عام ہے جو جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس دور میں اگر کوئی شیخ اپنے پاس کسی آنے والے کے خیال و رجحان کو اپنی فکر، توجہ، سخن، عملی نمونہ یا اشارات علمی کے ذریعہ نیکی اور تقویٰ کے رُخ پر لے آتا ہے تو یہ ایک کار عظیم ہے۔

مشائخ کے لئے اب صرف قدیم نصاب سے واقفیت کافی نہیں رہی۔ شیخ کے لئے اب ضروری ہے کہ وہ عالم ہو اور متقی ہو اور صحیح معنوں میں باطن کا معلم ہو۔ جبھی وہ اس دور کے آدمی کو متاثر کر سکے گا۔ اس دور کے شیخ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نفسیات کہاں ختم ہوتی ہے؟ اور روحانیت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ دوسرے مذاہب کے سری سلوک کی حدود و قیود کیا ہیں؟ اور تصوف میں سلوک کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچتا اور پہنچاتا ہے؟ اس دور میں بقول کسے لوگوں کی زبانیں کھل گئی ہیں لیکن کان اور آنکھ اور دل بند ہیں۔ ضروری نہیں کہ شیخ ہر شخص کے اعتراضات کا جواب دینے بیٹھ جائے لیکن اس قدر لازم ہے کہ وہ طالب کے گمان اور شک کو رفع کر سکے اور سمع و بصر و قلب کے دروازے کھول دے۔ کیونکہ جب تک کوئی دیکھتا، سنتا اور محسوس نہیں کرتا ہے۔ دل سے اسے مان نہیں سکتا۔ چنانچہ آج کل مشائخ کرام سب سے پہلے جذبہ و وجدان کو ہی انگیخت کرتے ہیں۔ طالب کے روحانی تجربات، رؤیاء اور اس کی واردات و کیفیات کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اور یوں روحانی شعور کو ترقی دے کر راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح محبت و معرفت سے اس کا ایمان قوی ہوتا جاتا ہے اور بالآخر وہ احسان کے بلند مرتبہ تک جا پہنچتا ہے جہاں وہ دیکھ کر عبادت کرتا اور اللہ کے قرب میں ترقی پاتا ہے۔

رُوحانی شعُور:۔

سلوک کے تمام مراحل میں ہر سطح کے روحانی تجربات اور واردات و کیفیات کا محرک وہ شعور ہے جسے سری سلوک میں وجدان کا نام دیا گیا ہے۔ مگر کیا یہ وہی

www.yabahu.com

وجدان ہے جسے سرہت پسند فلسفیوں اور ماہرین نفسیات نے جبلت کی ایک ترقی یافتہ صورت کہا ہے یا یہ شعور کی کوئی اور سطح ہے جس پر صوفی اعلیٰ درجہ کی محبت و معرفت سے لطف اندوز ہوتا ہے؟ اس بارے میں متکر صوفیاء نے کچھ ضرور لکھا ہے مگر اکثر کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ صوفیاء میں ایک رجحان تو یہ ہے کہ وہ اپنے کشوف و روحانی تجربات کے تجزیہ کی طرف مائل نہیں ہوتے ان کا تجربہ ہی بذات خود ایک وحدت معنی کے طور پر ان کے لئے کافی ہوتا ہے اور شاید ان کا اس طرح تجزیہ کیا بھی نہیں جا سکتا کہ دوسرے اس میں خود صوفی کی طرح شامل ہو سکیں۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ سیر منازل و مقامات آفاقی ہے یا انفسی؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ سیر آفاقی ہے نہ انفسی کیونکہ آفاق و انفس باہر اور اندر چاہتے ہیں اور یہ معاملہ منزہ ہونے کی وجہ سے دخول و خروج سے وراء ہے۔ لیکن ساتھ ہی وضاحت فرما دی کہ ان ارباب سیر کے نزدیک جو علم رکھتے ہوں یہ سیر دہلی و آگرہ کی سیر کی طرح ہے کہ معلوم و متمیز ہوتی ہے اور ایک منزل دوسری منزل سے جدا نظر آتی ہے۔ (۲۵)

شعور کی اس قسم کو وجدان کہتے ہیں۔ یوں تو کوئی حرج نہیں مگر اس سے مطلب واضح نہیں ہو پاتا مثلاً ملحد سرہت پسند بھی اپنے ذریعہ علم کو وجدان ہی کہتے ہیں جب کہ ان کا وجدان ان کا الحاد پر ہی قائم رہنے دیتا ہے بلکہ ان کی گمراہ کن فکر کا مئوید ہوتا ہے جیسے سارتر یا برگساں کا حال ہوا۔ مگر مسلمان صوفیاء کا یہ باطنی حاسہ انہیں ایسے اسرار الٰہی کی معرفت کا ادراک عطا کرتا ہے جو شعور کی کسی اور سطح پر منکشف نہیں ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ خوارزم میں شیخ نجم الدین کبریٰ قدس سرہٗ کے ورود کی خبر جب مولانا فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ نے سنی تو مولانا نے شیخ رحمتہ اللہ علیہ کو بلایا اور آپ سے پوچھا کہ

"آپ نے اللہ تعالیٰ کو کس چیز سے پہچانا ہے؟" تو شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا

کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو ان انوار سے پہچانا جو غیب سے مجھے پہنچتے ہیں کہ اس کی سمجھ سے عقلی واردات قاصر ہیں جو کہ شک میں ڈالتے ہیں۔ مولانا حیران رہ گئے۔

جدید دور کے ایک صوفی میاں محمد ظہور الدین احمد مرحوم نے بھی اصطلاح "وجدان" استعمال کی ہے اور اسے "یقین ذات وحدت" کہا ہے۔ پھر اسے "روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کا مادہ" بتایا ہے۔ لیکن بالآخر انہیں بھی احساس ہوا ہے کہ وہ شعور جو صوفی کو سدرۃ المنتہیٰ کے مقامات کی سیر کراتا ہے اور اس کے قلب پر ہر آن انوار و تجلیات کی جلوہ ریزی کا باعث بنتا ہے محض وجدان نہیں۔ چنانچہ انہیں لکھنا پڑا:

"روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے جو قوت قدرت نے انسان کو عطا فرمائی ہے"۔ اسے بعض لوگوں نے عشق کے نام سے پکارا ہے بعض نے بصیرت اور بعض نے عرفان کے نام سے پکارا ہے۔ بعض اسے محبت کہتے ہیں اور میں اسے انسانیت کے درجہ پر وجدان کے نام سے پکارتا ہوں۔ جو محبت کے قریب تر ایک جذبہ ہے۔(۲۶)

فرانس کے صوفی رینے گینوں (شیخ عبدالواحد یحییٰ) نے اسے "عقلی وجدان" کہا ہے۔ وہ بھی اسے سرہت پسندوں کے الحاد آموز وجدان کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے متکر صوفیاء نے اسے عقل کی ہی ایک اعلیٰ صورت قرار دیا تھا۔ انہوں نے عقل کے دو درجے بیان کئے۔ عقل جزوی تو دنیا داروں کے کاموں میں معاون ہوتی ہے لیکن عقل معاد یا عقل کلی حکمت الٰہیہ کو سمجھنے میں کام آتی ہے اور اس عقل کلی کے مقابلہ میں عقل جزوی کی کوئی حیثیت نہیں۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: "اگرچہ (عقل جزوی) کا ترازو درست ہے لیکن ایسے ترازو سے جس سے سونا چاندی تول سکتے ہیں، پہاڑ نہیں تول سکتے"۔ (۲۷) یہی نقطۂ نظر تمام صوفیاء کرام کا ہے۔ وہ عقل جزوی کو اس کے محل پر رکھتے

www.yabahu.com

ہیں اور معرفت اسرار الٰہی کے لئے عقل کلی کو کام میں لاتے ہیں جس کا دائرہ کار لا محدود و لا انتہا ہے۔

اس عقل کلی کے مشاہدہ کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ بعض صوفیاء کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ بعض نظری علوم میں جن کی انہوں نے کبھی تعلیم حاصل نہ کی وہ کتابوں کے حوالے تک دہرا سکتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ہزاروں میل پر بیٹھے ہوئے ایک شخص سے یا صدیوں پہلے کی وفات یافتہ کسی روح سے بات پوچھ کر بیان کر سکتے ہیں۔ صوفیاء کے تذکروں اور ملفوظات میں یہ ساری باتیں محض افسانہ طرازی نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں ایسا ہوتا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سُہروَردی رحمتہ اللہ علیہ نے "عوارفُ المعارف" میں کسی بزرگ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق ایک ہی ملکہ ہے جس کا نام عقل ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک کے ذریعہ انسان دنیا کے کاموں کو درست کرتا ہے اور دوسری کے ذریعہ انسان آخرت کے کاموں کو سنوارتا ہے۔ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی اپنی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ "عقل روح کی زبان ہے اور بصیرت کی ترجمان ہے" یعنی جب سالک نفس کی حالت سے اٹھ کر قلب کو صاف کر کے روح کو جلا دیتا ہے تو پھر عقل کلی بروئے کار آتی ہے۔ شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اسے "بصیرت" کہا ہے کیونکہ وہ باطن کی نظر ہے۔ اس نقطہ نظر سے عقل کلی کی ماہیت یہی بصیرت ہے جس کے متعلق وہ فرماتے ہیں۔

"بصیرت نہ صرف ان علوم کا احاطہ کر لیتی ہے جنہیں عقل (جزوی) مکمل طور پر حاصل کرتی ہے۔ بلکہ وہ ان علوم کو بھی اپنے اندر سما لیتی ہے جو عقل (جزوی) کے دائرہ سے باہر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بصیرت کو کلمات خداوندی سے فیض حاصل ہے' جو فنا نہیں ہو سکتے' خواہ سمندر خشک ہو جائیں عقل بصیرت کی ترجمان ہے۔ اسی لئے بصیرت اپنی بعض باتیں اس تک پہنچا دیتی ہے۔(۲۸)

غرضیکہ اسے عقلی وجدان کہا جائے یا عقل کلی' بصیرت کہا جائے یا صرف ذوق۔ یہ وہ روحانی شعور ہے جو براہ راست حکمتِ الٰہیہ کے حقائق تک پہنچا دیتا ہے۔(۲۹)

اس کی تشریح میں سب سے زیادہ دقت یہ پیش آتی ہے کہ یہ شعور جب بیدار ہوتا ہے تو پوری انسانی شخصیت کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اس میں جذبہ' خیال' ذوق و شوق سب شامل ہو جاتے ہیں۔ روحانی تجربے کے دوران میں جب صوفی دیکھتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے گویا اس کا پورا وجود آنکھ بن گیا۔ اسی طرح سنتا ہے تو اس کا پورا وجود کان بن جاتا ہے۔ بمصداق:

ہمہ دیدہ گشتہ چوں نرگس ترنگش

اور عقلی وجدان کے آلہ کار سمع و بصر یہی دو ہیں۔ تمام وجود کے سمع و بصر بن جانے کا یہ تجربہ ایسا ہے جو غیر صوفی لوگوں کو بہت کم ہوتا ہے' اس لئے وہ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح جب کوئی بشارت ملتی ہے یا موافق حال کیفیت وارد ہوتی ہے تو پورا وجود وجد و اہتزاز کے عالم میں گویا جھوم اٹھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے حضرت سلطان باھو قدس اللہ سرہ' نے اسے "عقل بیدار" کہا کہ جیسے اپنے وجود کے برابر یا اس سے بھی بڑی کوئی طاقت خوابیدہ تھی' جو اب جاگ اٹھی ہے۔

بہر جزو تا کے تامل کنی
محیطی گر اندیشہء کل کنی

(کب تک تو ہر جزو میں تامل کرتا رہے گا۔ تو اگر کل کو دھیان میں لائے تو درحقیقت تیرا علم ہر شے پر محیط ہے)

جامی رحمتہ اللہ علیہ نے اس رباعی میں تقریباً" اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

گر درِ دل تو گل گذر و گل باشی
در بُلبل بے قرار بلبل باشی

www.yabahu.com

تو جزوی و حق کُل است گر روزے چند
اندیشہ کُل پیشہ کنی کُل باشی

(اگر تیرے دل میں کُل کا خیال آئے تو تو کُل ہو گا۔ اور اگر بُلبُل بے قرار کا' تو پھر تو بُلبل ہو گا۔ تو جُزو ہے اور حق کُل۔ اگر کچھ دن تو کُل کو دھیان میں رکھنے کی عادت ڈال لے تو تو بھی کُل ہو جائے گا۔)

صوفیائے کرام نے جو اس شعور کو کئی نام دیئے اس کی وجہ یہ تھی کہ کبھی اس کا کوئی پہلو زیادہ منکشف ہوا یا کسی صفت کا زیادہ غلبہ ہوا تو انہوں نے اسے اسی کی نسبت سے موسوم کر دیا۔ کسی نے اس میں جذب دیکھ کر اسے عشق کہہ دیا تو کسی نے بصیرت' کسی نے عرفان کہا تو کسی نے وجدان' کسی نے عقل کلی کہا تو کسی نے عقلی وجدان۔ بہر حال قوت ایک ہی ہے جو کل اوصاف سے متصف ہے۔

یہ قوت کسی میں کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ۔ وجدان کی قوت نفسی سطح پر تو شاید ہر ایک میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے اور اسے تھوڑی سی مشق سے بڑھایا یا جگایا بھی جا سکتا ہے۔ سریت پسندوں کے ہاں یوگا کی کئی مشقیں اس کے لئے مقرر ہیں۔ لیکن عقلی وجدان یا عقل کلی کی بیداری کے لئے کسی تجربہ کار شیخ کی صحبت اور توجہ ضروری ہے۔

بَیعَت و صُحبَتِ شَیخ :۔

صحبت اور توجہ کے حصول کی خواہش سالک کو کسی شیخ کے ہاں پہنچا دیتی ہے جس سے وہ نگرانی و رہنمائی کا طالب ہوتا ہے اور اسے یا مرون بالقسط (۳۰) (جو انصاف کے ساتھ حکم کرتے ہیں) کے زمرے سے جانتے ہوئے اس کے احکام کی تعمیل کا وعدہ کرتا ہے' اسے بیعت کہتے ہیں۔ تصوف میں بیعت کی رسم پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے حالانکہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو صحبت اور توجہ کی خاطر کسی کامل صوفی استاد کی شاگردی اختیار کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ اب یہ اپنے اپنے شعبۂ

تعلیم و تربیت میں مروجہ لفظوں اور ناموں کا فرق ہے کہ سلوک میں استاد کو مرشد' شیخ یا پیر کہتے ہیں اور شاگرد کو مرید' سالک یا طالب کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات کی طبیعت اس سے بہت گھبراتی ہے کہ سلوک کی تعلیم میں مرید کے لئے اطاعت شیخ پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس طریقہ تربیت میں جسے سلوک کہا جاتا ہے' ایک شاگرد کسی کتابی علم اور قیل و قال کا نہیں بلکہ روحانی توجہ اور حال کا طالب ہوتا ہے اور اس حال میں معمولی سا تکدر یا لوث بھی روگ بن جاتا ہے جو طالب کو حصول فیض سے باز رکھ سکتا ہے۔ یہاں ایک ہی صورت ہے کہ اگر وہ ظاہر کے ساتھ باطن کی تکمیل چاہتا ہے یا فساد طبیعت کے علاج کا خواہش مند ہے تو اپنے تئیں شرح صدر کے ساتھ شیخ کے سپرد کر دے۔ اس شعر میں یہی بات کہی گئی ہے۔

قال را بگذار و مردِ حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

(باتوں کو چھوڑ کر صاحب حال بن جا اور اس کی خاطر اپنے آپ کو کسی مرد کامل کے سامنے پامال کر دے۔)

کہا گیا ہے "اس میں شک نہیں کہ ہر عہد میں ایسے اولیاء اللہ ہوتے ہیں جن کی زندگیاں اخلاق عالیہ کی نمونہ تھیں اور لوگ ان کے گرد رشد و فیض کے لئے جمع ہوتے تھے یقیناً" اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمان نہ اپنے آپ کو ان کی پیروی کا پابند سمجھتا ہے نہ ان سے کوئی رسمی بیعت کرتا ہے۔ وہ صرف صاحب وحی ہی کی پیروی کو واجب جانتا ہے"(۳۱)

اس قسم کے سارے مفروضے غلط فہمی کا نتیجہ ہیں کیونکہ یہ بیعت بھی جو مرید اپنے پیر کے ہاتھ پر کرتا ہے دراصل صاحب وحی ہی کی پیروی ہے۔ (۳۲) آپ ظاہری علم دیکھنے کے لئے تو مدارس اور جامعات میں چلے جاتے ہیں مگر روحانی تعلیم

www.yabahu.com

کے لئے اس علم کے کسی استاد کے پاس زاویہ یا خانقاہ میں جانا کیوں غیر ضروری سمجھتے ہیں؟۔ رہی یہ بات کہ "جدید تعلیم یافتہ مسلمان" اپنے آپ کو اس کا پابند نہیں سمجھتا تو اب یہ فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا ہے کہ "جدید تعلیم یافتہ مسلمان" حسی تجربے اور روحانی تجربے یا دنیاوی عقل اور روحانی شعور میں سے کس کو اولیت دیتا ہے۔ اگر روحانی تجربے کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے (اور ایسا کرنا پڑے گا کیونکہ ہمارے ہاں پاکستان میں تو نظریاتی اساس یہی خیال و تجربہ ہے) تو پھر رشد و ہدایت اور فیض صحبت کے لئے کسی شیخ کے پاس بہر صورت جانا ہو گا۔ اور وہ جسے فیض کہا جاتا ہے اس سے مراد بھی روحانی تجربہ کے لئے توجہ کا حصول ہے۔

بہر صورت مشائخ کی بیعت کو جو تصوف میں لازمی قرار دیا گیا' اس کا سبب بھی یہی ہے کہ شیخ کی عقل کلی کا پرتو جب سالک کے قلب یا معنوی وجود پر پڑتا ہے تو اس کا حاسہ روحانی بیدار ہو جاتا ہے۔ خواجہ علاؤالدین عطار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اہل اللہ کی دوام صحبت سے عقل معاد کو ترقی ہوتی ہے۔ اکثر شیخ کی ارادی توجہ سے ایسا ہوتا ہے لیکن اگر اس کی توجہ قوی الاثر ہو تو غیر ارادی طور پر بھی یہ قوت ہر ملنے والے کو متاثر کرتی رہتی ہے خواہ دوسرے کو اس کا ظاہری اور فوری اثر معلوم ہو یا نہ ہو۔ لیکن اثر ہوتا ضرور ہے۔ نقشبندی طریقے کے صوفیاء تو باقاعدہ حلقہ بنا کر توجہ دیتے ہیں مگر دوسروں کے ہاں ایسا ظاہری التزام ضروری نہیں۔

ایک صاحب مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے لئے دعا کی اور توجہ دی۔ توجہ کا حال وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے "اپنے سامنے بٹھایا اور بلند آواز سے جلال کے ساتھ فرمایا۔ آنکھیں بند کر لو ہم توجہ دیتے ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ حضرت نے جس طرح چاہا توجہ دی لیکن مجھ کو معلوم نہیں ہوا۔ پھر فرمایا آنکھیں

کھول دو' میں نے آنکھیں کھول دیں حضرت نے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ جاؤ انشاء اللہ عمر بھر کے لئے کافی ہے"۔ ان صاحب کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد فرمایا کرتے تھے' حضرت صاحب نے جو توجہ دی تھی وہ اس وقت اور اس کے بعد عرصہ تک کچھ بھی محسوس نہ ہوئی۔ ہاں آخر عمر میں وہ اس توجہ کا اثر دل میں پاتے تھے۔(۳۳)

آدمی خواہ کیسی ہی عبادت کرتا رہے مگر یہ حاسہ پوری طرح بیدار نہیں ہو پاتا گو کوئی اپنے زعم میں ایسا ہی سمجھتا رہے۔ اس فقیر کو یہ تجربہ اس وقت ہوا جب کچھ سال پہلے حضرت سید محمد وراثت حسین شاہ رحمتہ اللہ علیہ (۳۴) کے ہاں ذوق کا طالب ہوا۔ اس سے پہلے نوافل و تلاوت کے نتیجے میں کچھ صفائی ضرور ہو چکی تھی مگر جب ان کی خدمت میں پہنچا تو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے بجلی کا بٹن آن کر دیا ہو۔ جیسے ایک دروازہ کھول دیا گیا ہو۔ ان کی توجہ سے جو محض ان کی خدمت میں کچھ دیر حاضر رہنے سے حاصل ہوئی۔ یہ حاسۂ باطنی اس قدر بیدار ہوا کہ بس آنکھ بند کرنے کی دیر ہوتی تھی۔ غیبت سی طاری ہو کر مطلوبہ مفہوم کشف یا الہام کی صورت میں بند فقیر پر کھل جاتا تھا۔ البتہ یہ یاد رہے کہ اگر خود کچھ مجاہدہ نہ کیا ہو تو جس طرح آسانی سے کسی بزرگ کی صحبت میں یہ طاقت حاصل ہوتی ہے اسی قدر تیزی سے لاپرواہی کی صورت میں چلی بھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے نوافل' تلاوت' نیک کاموں کے کرنے اور لغو امور کے پرہیز سے یہ قوت محفوظ رہتی ہے۔

شور و شغب اور دنیاوی امور میں انہماک وغیرہ بعض اوقات منتہی لوگوں میں بھی اس قوت کو کند کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو بھی وقتاً" فوقتاً" خلوت اور گوشہ نشینی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اس قوت کو مجتمع کر سکیں۔ شیخ کامل' منتہی سالک یا کسی قلندر مرد کی صحبت و معیت بھی اس کی بحالی

www.yabahu.com

اور کار برآری میں معاون ہوتی ہے۔

غرضیکہ عقلی وجدان کی بیداری کے لئے شیخ کے ہاں حاضر ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ اس قوت کے رموز اور طریق کار سے بے خبر ہیں' اگر وہ کسی شیخ کے ہاں حاضر ہوتے بھی ہیں تو چونکہ قلب سلیم لے کر نہیں جاتے اس لئے بے فیض ہی رہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بھی اچنبھے کی بات ہے کہ یہ حاسہ باطنی جب بیدار ہوتا ہے تو شرعی امور کی حکمت تک ظاہر و باطن میں کھلنے لگتی ہے' فکر و عمل میں تذبذب کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے' ہر قدم پر قلب حکم کرنے لگتا ہے اور اس کا یہ حکم حکمت و مصلحت سے مملو ہوتا ہے۔ قلب کا یہ حکم ذہن و دماغ پر بھی چلتا ہے اور جسم پر بھی۔ کئی بار اکثر فقراء سے یہ سننے میں آیا ہے کہ ہمیں اب یہاں سے جانے کا حکم ہو گیا ہے یا فلاں جگہ قیام کا حکم ہوا ہے' وہ یہی قلب سلیم کا حکم ہوتا ہے۔ جو باطن میں کسی بادشاہ کی طرح حکم صادر کرتا ہے۔ جس کی تعمیل میں سرتابی کی مجال نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں ان کے رب نے اس تجربے سے مشرف کیا ہو۔

باطن کے یہ روحانی تجربات اور عقل کلی' عقل بیدار یا عقلی وجدان کی یہ کرامات سالک کو ان اہم مقامات تک پہنچاتی ہیں جنہیں فنا و بقاء سے موسوم کیا گیا ہے۔

فنا و بقاء :۔

اس دور میں منکرین تصوف نے فنا کا غلط مفہوم سمجھ کر اکثر تصوف کو تنقید کا ہدف بنایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تصوف کی بعض دیگر اصطلاحات کی طرح اسے بھی غلط ہی سمجھے۔ اس فقیر کا خیال ہے کہ فنا کا اصل مفہوم اس لئے ان سے اوجھل رہا کہ وہ صاحب حال نہ تھے۔ انہوں نے محض فلسفہ کی لوث سے تصوف پر نظر ڈالی' لیکن تصوف وہ علم نہیں ہے جسے دور سے دیکھ کر یا باہر سے مطالعہ کر کے

سمجھا جا سکے۔ چونکہ وہ در دن خانہ ہنگاموں سے باخبر نہ تھے' اس لئے وہ حقیقت حال سمجھنے سے معذور رہے۔

جدید دور کے مغربی فلسفہ پڑھنے والے دانشوروں نے اعتراض کیا تو ان کے ذہن میں انسانی شخصیت کی انفرادیت کا ایک خاص تصور تھا۔ وہ شخصیت کی اس انفرادیت کو اس قدر اہمیت دینے لگے۔ کہ اس کے تشخص میں کسی اور عنصر کے داخل ہونے کو انہوں نے گراں محسوس کیا۔ اور شخصیت کے لئے ضرر رساں سمجھا۔ اور اگر دینی حلقوں سے اعتراض ہوا ہے تو وہ ان ظاہر پسندوں کی طرف سے پیش کیا گیا جو خالق و مخلوق یا عبد و معبود میں کبھی اور کسی طرح ختم نہ ہونے والے فرق کے شدت سے قائل ہیں۔ اول الذکر کا اعتراض تو اس لئے قابل اعتناء نہیں کہ مغرب کے فلسفیوں کی انفرادیت پسندی ویسے ہی گمراہ کن ہے کہ اس کی حدود و قیود بھی وہ اپنے وہم و گمان سے ہی متعین کرتے ہیں البتہ دینی حلقوں میں اگر یہ بات کہی گئی ہے تو جیسا کہ برکمارٹ (ابراہیم اعزالدین) نے کہا ہے۔ یہ اشکال ایک صوفی اور ظاہر پسند کے درمیان رویہ یا نقطہ نظر کا بنیادی امتیاز ظاہر کرتا ہے گو ظاہر پسند بھی خدا کے سامنے اپنی حیثیت کو نیست سمجھتا ہے مگر وہ خدا اور بندے کے درمیان فرق کو نہیں بھولتا۔ اس کے برعکس صوفی اصولی طور پر تمام مخلوق میں بنیادی وحدت کی معرفت پر یقین رکھتا ہے یا خدا کے سامنے ہر شے کو بے حقیقت سمجھتا ہے۔ وہ روح کو امر ربی سمجھتا ہے جو اپنی ماہیت میں ازلی اور لافانی ہے۔ قل الروح من امر ربی۔ برکمارٹ نے وضاحت کی ہے کہ اگر ظاہر پسند ما بعد الطبیعاتی مفہوم کے ساتھ اپنے عقیدے پر ہی قائم رہے تو وہ منطقی طور پر صوفی کے نظریئے پر صاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا کیونکہ اپنی حقیقت کو اس کی کُنہ میں تو وہ بھی نیست نہیں سمجھتا اور یوں اس کی اپنی ذات کی حقیقت' الٰہی حقیقت کے ساتھ مماثل ہو جاتی ہے۔ (۳۵) لہٰذا یہ انفرادیت یا "فراق" کا واہمہ رفع ہو جاتا ہے اور

www.yabahu.com

فناء پر اعتراض کی پہلی شکل نہیں رہتی۔

تصوف میں بھی فناء پر گفتگو دو زاویوں سے کی گئی ہے۔ ایک نقطۂ نظر تو محض علمی ہے جس پر یہاں زیادہ کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر روحانی تجربہ سے متعلق ہے جس کی تفصیل یہاں مناسب اور بر محل ہے۔

فناء کے روحانی تجربے کے ذکر میں یہ بات پہلے ہی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فنا ایک کیفیت ہے یا ایک حال ہے جو اپنی حقیقت کو ذات خداوندی کے سامنے حاضر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بدیں وجہ صوفیاء اپنی کیفیت میں صرف فنا کے تجربے سے ہی نہیں گزرتے ہیں' وہ فناء کے ساتھ بقاء کا بھی اس طرح احساس کرتے ہیں کہ فناء اور بقاء دونوں لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں ان لوگوں کا اعتراض باطل ہو جاتا ہے جو صرف فنا کو ہدف تنقید ٹھہرا کر بات کرتے ہیں' کیونکہ صوفیاء نے ہمیشہ فنا کے ساتھ بقاء کی بھی بات کی ہے جیسے فنا عن المعاصی اور بقاء الطاعتہ (گناہوں سے فانی ہو جانا اور اطاعت پر باقی رہنا) یا جہات سے فنا اور الٰہی معرفت میں بقاء وغیرہ۔

متکلمین اسلام کے خیال کے مطابق فنا اس کاروائی کا نام ہے جس میں شے کے اوصاف معدوم ہو جاتے ہیں اور بقاء انہی اوصاف کے دوام کا نام ہے۔

صوفیاء نے مختلف طریقوں اور اپنے اپنے انداز میں فناء کا حال بیان کیا ہے مثلاً" بندے کی "انا" جب رب کی انا میں غائب ہو جاتی ہے تو اسے فنا کہتے ہیں۔ فناء میں عبد کا محدود شعور اپنے رب کے لا محدود شعور میں گم ہو جاتا ہے اور جب الٰہی شعور عبد کے قلب میں جگہ پا لیتا ہے تو اسے بقاء کہتے ہیں۔

کچھ غلط فہمیاں صوفیاء کرام کی مثالوں سے بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً" فناء اور بقاء کی حالتوں کے لئے برف اور پانی' لوہے اور آگ' قطرے اور سمندر کی تشبیہات سے کام لیا گیا' لیکن مطلب سب کا ایک تھا۔ تشبیہ میں ایک غلط فہمی اس وقت

پیدا ہوتی ہے جب سامع یا قاری تشبیہ کی تمام جزویات کو منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ تشبیہ یا استعارے کے بے سبب پھیلانے سے مزید مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ ان تمام مثالوں اور تشبیہوں کے باوجود صوفیاء نے فناء کے تجربے کی جو مختلف صورتیں یا مختلف مرحلے بیان کئے ہیں اس میں اپنی ذات کا شعور برقرار رہتا ہے۔ سالک صرف بعض خصائص کو فناء کرتا اور اعلیٰ خصائص کو اپنا کر ان کے ذریعے یا ان کے اندر بقاء پاتا ہے۔

حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ کی تشریح کے مطابق روحانی تجربے میں فناء کی کیفیت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان پر بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے' یہ حالت نیند سے مشابہ ہے۔ در اصل اسی کیفیت کو زیادہ تر مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ یہ کوئی نفسی کیفیت نہیں ہے کہ جس کا روحانی لحاظ سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا' یہ ایک ایسی روحانی کیفیت ہے کہ جس کے رفع ہونے کے بعد روح زیادہ قوی ہو جاتی ہے' قلب و روح دونوں امت و نور سے معمور ہو جاتے ہیں اور اس کی مثال یوں ہے جیسے بجلی کی بیٹری چارج کر لی گئی ہو۔ سردار اقبال علی شاہ کی وضاحت کے مطابق اس تجربے سے ایسا نہیں ہوتا کہ محدود انا لا محدود انا میں جذب ہو کر اپنا تشخص مٹا رہی ہو۔ بلکہ اس کی صورت کچھ یوں ہے گویا لا محدود انا فرط محبت سے محدود انا کے ساتھ بغلگیر ہو گئی ہو۔ (۳۶) اس سے ایسی بے انتہا قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کو گولیوں کی بوچھاڑ میں سکون سے عبادت میں مشغول رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے لیکن کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ سلوک میں یہ ابتدائے حال کی کیفیت ہے۔

حضرت شیخ الاکبر نے دوسری صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ سالک علماً" و حالاً" خدا اور خودی دونوں کا احساس کرتا ہے اور وجدانی معرفت کی کیفیت میں گم ہو کر

www.yabahu.com

اسے وحدت کلی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عربی کے نزدیک سالک کی ذات کے فناء ہونے کا مطلب ایسی کیفیت ہے' جس میں نفس کے عدم اور روح کے بقاء کی معرفت حاصل ہو۔ ان کے خیال میں مکمل صوفی وہ ہے جو علماً" و حالاً" اسماء و صفات اور اضافتوں سے گزر کر ذات خداوندی کو مورد توجہ بنائے اور فناء کے ایسے تجربے سے گزرے کہ اسے ذات الٰہی میں خالق' مصور اور رازق وغیرہ نام بے معنی نظر آئیں اور کائنات میں وہ حق کے ظہور کے علاوہ کچھ نہ دیکھے صورت اور حقیقت کو اس طرح پہچانے کہ صورت کے متعلق عدم ہونے کا بھی اسے یقین ہو۔ اور دونوں میں اصل وحدت کی بھی اسے معرفت حاصل ہو۔ یہ کیفیت سلوک کی انتہا میں حاصل ہوتی ہے۔(۳۷)

بہرحال فنا سے بقاء کو جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ فنا کے مترادف ہے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ بقاء کے' کلمہ طیبہ میں لَا اِلٰہَ فنا ہے اور اِلَّا اللّٰہُ بقا ہے۔ اس میں نفی اور اثبات گویا فناء اور بقاء کے مترادف ہیں۔ مختلف طرق میں اس کے ذکر کے ذریعہ یہ معرفت حاصل کی جاتی ہے۔

مختصراً" علمی سطح پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی کے عقلی وجدان کا رابطہ اس عقل کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جسے سب سے پہلے تخلیق کیا گیا۔ چنانچہ فناء کے تجربہ میں اس پر اپنی روح اور ذات خداوندی کی بنیادی وحدت کا راز کھلتا ہے اس طرح صحیح معنوں میں اسے علم غیب پر حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی بقاء ہے اور صوفی کے لئے یہ ایک بہت بڑی مسرت کا مقام ہوتا ہے۔ سب سے بڑا صوفی وہ ہوتا ہے جو کہیں مقام نہ کرے۔ سلوک میں ارتقاء کا سفر جاری رکھے۔ ایک ولی اللہ کے لئے تجلیات اور واردات کی کوئی انتہاء نہیں۔ قرب کے درجات بے شمار ہیں اور اسی طرح اسرار الٰہی کی معرفت کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ رُومی علیہ الرحمتہ نے تنبیہہ فرمائی ہے:

در نیابد حال پختہ' ہیچ خام
پس سخن کوتاہ کُن باید والسّلام

یعنی خام اور نا تجربہ کار کسی عارف کے حال کو نہیں سمجھ سکتا' پس اس مقام پر بات مختصر ہی مناسب ہے۔

علم و معرفت کی خصوصیت :۔

سلوک کی تکمیل کے بعد وہ کیا خصوصیت ہے جو منتہی کو حاصل ہوتی ہے اور اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں اختلاف کی خاصی گنجائش نکل آئے گی اور شاید یہیں سے بعض کے دلوں میں صوفیاء کے خلاف تعصب اور حسد کی بھی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ دین ایک شاہراہ عظیم ہے' جو لوگ اسے ایک پگڈنڈی بنا کر اپنے تئیں اس پہ راہنما کا درجہ دینا چاہتے ہیں' عُجب میں مبتلا ہیں۔ اس کشادہ راہ پر جو خدا کی طرف جا رہی ہے' بے شمار راستے ہیں اور جو بھی ان پر چلتا ہے وہ خدا کا قرب پا لیتا ہے۔ ہر مومن بلکہ ہر انسان کی فطرت میں اصولی طور پر وہ احساس قرب ذات کی کسی لطیف سطح پر پہلے ہی موجود ہے۔

نحن اقرب من حبل الورید (ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ) لیکن ایک مومن اس قرب کو یقین کے کسی درجے پر جاننے اور پہچاننے کی بھی سعی کرتا ہے۔ جس پر آخرت میں ثواب مترتب ہو سکے۔ صوفی کا تو اس کے سلوک میں مطمع نظر ہی یہی ہوتا ہے جیسا کہ شیخ الاکبر ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ نے فناء کے ضمن میں تصریح فرمائی ہے۔ مگر عام مومن بھی کسی نہ کسی حد تک اس کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور اقرار و تصدیق ایمان کے ساتھ اسلام کی ظاہری تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اللہ کے قُرب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اب تقویٰ اور سلوک میں آگے بڑھ کر وہ قرب کے کس درجہ پر پہنچتا ہے یہ اس کا اور اللہ کا

www.yabahu.com

معاملہ ہے کسی دوسرے کو اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ الا ما شاء اللہ ان آیات سے یہی مفہوم مستنبط ہوتا ہے۔

والذین جاھد و فینا لنھد ینھم سبلنا و ان اللہ مع المحسنین (۲۹ ـ ۱۹)

(اور جنہوں نے ہمارے واسطے محنت کی۔ ہم ان کو اپنی راہیں سوجھا دیں گے اور بے شک اللہ نیکی والوں کے ساتھ ہے۔)

قل کل یعمل علی شا کلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا"

(۱۷ ـ ۸۴)

تو کہہ ہر کوئی اپنے ڈول پر کام کرتا ہے۔ سو تیرا رب بہتر جانتا ہے کون خوب سوجھا ہے راہ)

گویا قرب اور اس کے ساتھ متعلقہ صفات اور کسی حد تک تسلیم و رضا وغیرہ کی کیفیات کے لئے سلوک کے نصاب کا مکمل کرنا ضروری نہیں اور اس کے لئے باقاعدہ روحانی تجربات و مکاشفہ اور مشاہدہ کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف یقین کی عام سطح کی حد تک ظاہر میں ایک عام مومن کو بھی ایسے مشاہدات کا موقع ملتا ہے کہ وہ خدائی کاموں اور ان کی مصلحت کے بارے میں علم الیقین یا قدرت یاوری کرے تو عین الیقین کی حد تک پہنچ ہی جاتا ہے مثلاً" ہر مومن دعا کی قبولیت کے نشانات دیکھتا ہے۔ یا رویاء کے ذریعہ مکشوفات سے الٰہی حکمتوں کو جان لیتا ہے۔ اپنے مراتب سے ایسے نیکو کار لوگوں کی اس عدم واقفیت کو بھی علماء نے مستحسن گردانا ہے تو وہ اپنی جگہ پر بجا ہیں۔ یہ متقی مومن بغیر کسی ردو کد کے راہ پر رواں دواں رہتے ہیں اور ان میں بھی آخر کار خود بخود عام معاملات دین و دنیا میں ایک قسم کا صوفیانہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے جسے تسلیم و رضا کہتے ہیں۔

لیکن وہ جو سلوک میں منتہی ہوتے ہیں حق الیقین کے مرتبہ کے علاوہ انہیں دو اہم خصوصیات حاصل ہوتی ہیں جو دوسروں میں بدرجہ اتم نہیں ملتیں کیونکہ اگر

کہیں مل بھی جائیں تو ناقص سطح پر ہوں گی۔ ایک تو اسرار الٰہی کی معرفت ہے جسے علم لدنی کہتے ہیں۔ اس معرفت میں وہ نہ صرف دوسروں سے متمیز ہوتے ہیں بلکہ حکمتِ الٰہیہ کے رموز و غوامض کی تلاش میں نکلے ہوئے لوگوں کے لئے معلم و مربی بننے کے بھی وہی اہل ہوتے ہیں۔ یہ وہ عارف ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والی ساری راہوں کی حکمت کو جانتے ہیں۔ ان راہوں کے خطرات سے بھی واقف ہیں اور سفر میں سہولت کے طریقوں کو بھی جانتے ہیں۔ ان کے پاس وہ نظر ہوتی ہے جو نبوت کی آنکھ کا خاصہ ہے۔ انہیں وہ ذوق ملتا ہے جو شواہد نبوت کا براہ راست اپنی ذات میں شاہد ہو جاتا ہے۔

"اسناد ہ وجود ہ" (اس کا وجود ہی اس کی سند ہے) سے یہی مراد ہے۔(۳۸)

حقیقت میں یہی حقیقی عالم ہیں اور یہی عارف باللہ ہیں۔ یہاں علم و معرفت میں تمیز کی ضرورت نہیں۔ علم و معرفت ایک ہی بات ہے اور وہ اسرار الٰہی کا علم اور ان کی معرفت ہے۔ یہی علم ہے جس کے بارے میں نبی کو دعا کرنے کے لئے کہا گیا۔ **قل رب زد نی علما"** (اے میرے رب میرا علم بڑھا دے) غرضیکہ سلوک کے منتہی حکمتِ الٰہیہ اور اس کے علم کے مقام پر ہوتے ہیں۔ ان کے درجات اللہ کے نزدیک لا محدود ہیں اور ان کے فضائل و خصائص بھی بے شمار ہیں۔

عشق و محبت :۔

عام زبان میں لوگ انہیں اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ علم و معرفت کے بعد دوسری خصوصیت ان میں یہ ہے کہ ان کے علم میں یبوست یا خشکی نہیں ہوتی۔ ان کے باطن میں وہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے جو جذبہ کی سطح پر ان کو اس جاذبہ سے ملا دیتا ہے جسے جذبۃ الحق کہا گیا ہے اور جو اللہ کی طرف سے بندے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس ذوق اور عشق و محبت کی تعریف میں شعراء و صوفیاء نے دفتر کے دفتر سیاہ کر

www.yabahu.com

دیئے۔ لیکن پھر بھی اس کی تعریف میں کوئی حرف آخر نہ کہہ سکے۔ یہ وہ جذبہ ہے کہ جسے جب تک محسوس نہ کیا جائے اس کی تاثیر کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔

ذوق ایں بادہ نمی دانی حریفا تا نچشی

اسی لئے ظاہری علم کے مدعی اس سے بسا اوقات محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی رحمتہ اللہ علیہ ایک بار قصور تشریف لے گئے تو وہاں ایک اہل حدیث سے سماع کے بارے میں بات ہوئی جو عشقیہ نسبت تک پہنچی اس نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم لوگوں میں عشق نہیں۔ تب آپ نے اپنی بولی میں فرمایا۔ ہاں ہمیں تو ہے اور آپ کے ہے یا نہیں یہ آپ کو خبر ہو گی۔ (۳۹) مراد آپ کی یہ تھی کہ چونکہ تم ظاہر میں اٹک کے رہ گئے ہو لہٰذا یہ راستہ تو تم نے خود مسدود کر دیا تمہیں اس معاملے کی اب کیا خبر ہو سکتی ہے۔

محبّت اور اِطاعت :۔

بعض ظاہر پسندوں کے خیال میں ایک مسلمان صرف اطاعت کے لئے مکلّف ہے اور گو وہ محبت کو "اتنی غیر معمولی اہمیت کی چیز" بتاتے ہیں۔ "کہ اس کے بغیر ایمان ایک لفظ بے معنی بن کر رہ جاتا ہے" لیکن پھر محبت کو تصور دین بنانے پر معترض ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صرف اطاعت سے بھی آخر میں محبت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے بلکہ توفیق شامل حال ہو تو اطاعت محبت کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہے۔ ایمان کی ابتداء اطاعت سے ہوتی ہے۔ اور اس کی تکمیل محبت پر ہوتی ہے لیکن صوفیاء کرام اطاعت بھی اسی کو مانتے ہیں۔ جو محبت کے بعد عمل میں ظاہر ہوتی ہے وہ محبت کو پہلے رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین لکھتے ہیں۔

"اطاعت صرف ثمرہ محبت اور نتیجہ محبت ہے نہ کہ اصل حقیقت محبت ـــ بات در اصل یہ ہے کہ جو لوگ محبت کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ خود بادۂ محبت کے مزے سے بے خبر ہیں"۔(۴۰)

مگر ظاہر پرستوں کے نقطہ نظر سے محبت کو تصور دین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ان کے ہاں محبت اور عشق کے لغوی معنوں کی بحث اور دونوں میں فرق کی کوشش اس لئے فضول اور بے بنیاد ہے کیونکہ اصولی طور پر جو لوگ محبت اور عشق کو جن معنوں میں اپنے عمل و عقیدہ کی بناء قرار دیتے ہیں وہی منکرین کے لئے قابل قبول ہونے چاہیں۔ شیخ الاکبر نے فرمایا کہ قرآن مجید میں عشق کو فرط محبت سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح امام غزالی نے محبت کی اس طرح تعریف کی ہے۔ محبت طبیعت کا میلان ہے' ایسی شے کی طرف جس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ میلان طبیعت پختہ اور قوی ہو جاتا ہے تو اس کو عشق کہتے ہیں۔ ان وضاحتوں کو ظاہر پسند نظر انداز کر کے اطاعت پر زور دیتے ہیں تو اس میں ان کی گوناگوں مصالح پوشیدہ ہیں۔

دین کا قرآنی تصور اس قدر تنگ نہیں ہے جتنا متصور کر لیا گیا ہے۔ اطاعت تو اوامر و نواہی کی پابندی کا ایک ظاہری عمل ہے۔ یہ بات سمجھنا کچھ اس قدر مشکل تو نہیں ہے کہ ایسی اطاعت پر جس پہ دل مائل نہ ہو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن محبت پر جس میں اطاعت ہی اطاعت بلکہ اعلا درجہ اتباع بھی ہے' کیسے اعتراض ہو سکتا ہے۔ پھر یہ عجیب ستم ظریفی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ محبت کو لوگوں نے تصور دین بنا ڈالا اور اس کے کچھ نتائج لکھتے ہیں تو مثالیں غیر اسلامی سری سلوک سے لے آتے ہیں۔(۴۱)

قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے بجا طور پر اسلام کو دین المحبت کہا ہے۔ کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت تصور دین کی بنیاد ہے اور اس محبت میں یقیناً عقل و ہوش بلکہ انسان کی ساری صلاحیتوں اور قوتوں کی بیداری لازمی امر ہے۔ اگر تقویٰ میں کوئی مومن آگے بڑھے گا اور قرب الٰہی کے اعلیٰ مقامات کو اپنا مقصود بنائے گا تو عشق الٰہی ہی اس کی دستگیری کرے گا اور کوئی ذریعہ اس کی امداد کا

www.yabahu.com

نہیں ہے۔

لوگ جو اللہ کی راہ میں جان و مال نثار کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دور سے لے کر آج تک کے زمانے تک اس کی بہت مثالیں مل جائیں گی۔ کیا وہ محض اسلام کا نعرہ لگانے والے چند ظاہری اقتدار کے طالب لوگ ہوتے ہیں؟۔ ایسا نہیں ہوتا وہ محض اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے سرشار ہو کر ہی ایسا کرتے ہیں اور اب اسی محبت کو سیاست ملکی کے تابع کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جا رہی ہے بلکہ اسے ضرر رساں خیال کیا جا رہا ہے۔

تصوف میں تو ابتدا بھی عشق و محبت ہے اور انتہاء بھی عشق و محبت۔ اس محبت میں معرفت بھی شامل ہوتی ہے اور یہی دونوں صوفیوں اور درویشوں، فقیروں اور اللہ والوں کا راس المال ہیں۔

ناکام صُوفی :۔

اس موقع پر بعض معترضین ان صوفیوں کی فہرست لے بیٹھتے ہیں جو راہ میں ہی رہ گئے یا ناکام رہے مگر وہ یہ بات فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ بحث کے موقع پر مثال کامیاب افراد اور ان کے مفید وجود کی دی جاتی ہے نہ کہ ناکام لوگوں کی، ناکامیاں تو ہر شعبے میں ہوتی ہیں۔ مگر ان کو بطور مثال پیش نہیں کیا جا سکتا ورنہ خلط بحث کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

مَردانِ حق اور تفویض کار :۔

ایک سوال تصوف و سلوک کے بیان میں بالکل شروع میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر وہ لازمی طور پر ذہن میں ابھرتا ہے یعنی: کیا تصوف اور سلوک ہر ایک کے لئے ضروری ہے؟۔ اس کا جواب یقیناً" اثبات میں ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں۔

"جس شخص کو تصوف کا ذوق نہیں دیا گیا۔ اس کو حقیقت نبوت سوائے اس کے کہ یہ ایک نام یا لفظ ہے اور کچھ نہیں معلوم"۔

لیکن نبوت کی حقیقت کو جاننا ہر ایک کے لئے بقدر استعداد ضروری ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔

۔۔۔۔۔ "اور جسے یہ ذوق مقدر نہیں کیا گیا وہ تجربے سے اور محض سن کر بھی اسے سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ ایسے لوگوں کی معیت اور ہم نشینی بکثرت اختیار کرے۔ قرائن احوال سے بھی یہ کیفیت یقیناً" سمجھ میں آ سکتی ہے جو شخص بھی اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کرے گا۔ وہ ان سے ایمان حاصل کرے گا۔ یہی ایک ایسا گروہ ہے جس کا صحبت یافتہ کبھی شقی و محروم نہیں رہتا"۔(۴۴)

گویا ان کی صحبت بجائے خود ایک روحانی تجربہ ہوتی ہے جس سے نبوت اور نبوت کی تعلیم پر ایمان بڑھتا ہے۔ اور حقائق اشیاء کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جیسی کہ در اصل وہ ہیں۔

البتہ یہ بات ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ وہ لوگ جو لکھنے پڑھنے کے لئے تعلیمی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں شامل ہوتے ہیں وہ سبھی متعلقہ علوم کے منتہی نہیں ہو جاتے۔ اسی طرح وہ لوگ جو تصوف کے دائرے میں کسب فیض کے لئے داخل ہوتے ہیں سبھی بڑھ کر مشائخ کبار نہیں ہو جاتے۔ تصوف کی مبادیات تو اصول دین میں سے ہیں مثلاً" ہدایت کی گئی ہے کہ ذکر کو ہر حالت میں اپنے پر لازم کیا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت دل میں پیدا کی جائے اور ان باتوں کے لئے اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے کیونکہ اس کے بغیر علم حاصل ہوتا ہے نہ اعمال میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ جو نیت کی درستی کے لئے ضروری ہے۔ الاعمال با النیات (اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے) اب آگے اپنی اپنی استعداد اور ظرف پر منحصر ہے کہ کون کہاں تک پہنچتا ہے۔ کچھ لوگ اگرچہ دیگر دینی و دنیاوی امور میں بڑھے ہوتے

www.yabahu.com

ہیں اور ان کا صواب کا دائرہ بھی دراصل وہی ہوتا ہے مگر سلوک میں وہ مبتدی ہی رہتے ہیں۔ اہل اللہ کی رہنمائی میں وہ اپنے علم و حال میں جس حد تک ان کے مقدر میں ہے صراط مستقیم پر رہتے ہیں۔ دوسرا درجہ متوسطین کا ہے۔ جو زیادہ وقت سلوک کو دیتے ہیں مگر پھر دنیا کے کاموں سے ان کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ شرعی لحاظ سے ان کو چھوڑ دینا ان کے لئے مستحسن نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے اذکار و اوراد اور وظائف کی وجہ سے مستقیم الاحوال رہتے ہیں اور بزرگوں کے فیض سے خاصا حصہ انہیں ملتا ہے۔ بلکہ یہ اکثر ان کے تبلیغی' تدریسی اور روحانی امور میں ان کے معاون ہوتے ہیں۔ آخری درجہ سلوک میں منتہی لوگوں کا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جسے اللہ نے اپنے لئے چن لیا۔ یہ اپنے سلاسل میں خلفاء اور خلقت کے لئے مربی و معلم بنتے ہیں۔ نہ صرف دینی و روحانی امور میں قائد ہوتے ہیں بلکہ امور تکوینی بھی ان کی دعا و برکت سے سر انجام پاتے ہیں۔ ان کو ان کی استعداد' قابلیت اور رجحان کے مطابق کام یا مناسب تفویض کئے جاتے ہیں۔ ان تمام سالکین کو ان کے مراتب اور دانش کی مطابقت میں بہرۂ یقین و معرفت حاصل ہوتا ہے۔

مَناصِب :-

سلوک کے نصاب کے دوران میں صوفیاء کرام کو اکثر گوشہ گیر بھی ہونا پڑتا ہے۔ مگر سلوک کی تکمیل کے بعد وہ خلقت کے درمیان میں ہی آ کر رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ اسے ان کی اصطلاح میں صعود یا عروج کے بعد نزول کہتے ہیں۔ یہ وہ مردان حق ہیں جو محض اللہ کی خوشنودی اور رضا کی خاطر خلقت کی طرف نزول کرتے ہیں ورنہ ان کے دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگوں کی طرف سے تحسین و ملامت اور معاشرے میں مسکینی و تونگری کی حالتوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ فنا فی اللہ کے بعد ان کا مقام بقاء باللہ کا ہوتا ہے۔

یہ اولیا اللہ لوگوں کے درمیان رہ کر مختلف حیثیات میں کام کرتے ہیں۔ یہ

اپنے دنیاوی مناصب کے لحاظ سے بھی اکثر ظاہر میں فیض رساں رہتے ہیں خواہ ان کی روحانیت کو کوئی بتمام و کمال سمجھ سکے یا نہیں۔ اگر اپنے سلاسل میں انہیں مشائخ کا جانشین بنا دیا جائے تو پھر درویشوں اور سالکوں کی تربیت کے کاموں میں ہی مصروف ہو جاتے ہیں' ورنہ جہاں کہیں معاشرے کے جس شعبے میں وہ ہوں بغیر کسی امتیازی نشان کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی ان کا دنیاوی ظاہری منصب ان کے روحانی منصب کو لوگوں کی نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیتا ہے کہ صرف اہل نظر ہی ان کے حقیقی روحانی مقام کو پہچان سکتے ہیں۔ بہر صورت یہ لوگ جہاں بھی ہوتے ہیں۔ ظاہر و باطن میں ان کی برکت محسوس کی جاتی ہے۔ یہ اہل اللہ اس قدر خفیہ بھی نہیں ہوتے کہ کسی کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہی نہ ہو سکے۔ اگر آدمی نیکو کار لوگوں کی صحبت کی تلاش میں رہتا ہو اور اس کا قلب اللہ اور اس کی ہدایت کی طرف مائل ہو۔ تو محض اپنی فراست و بصیرت کے طفیل ان کی قربت کو محسوس کر کے ان سے ملنے کا موقع پا لیتا ہے۔

ان اہل اللہ میں ایک طبقہ اپنے آپ کو بالکل پوشیدہ بھی رکھتا ہے۔ یہ لوگ دراصل ملائکہ کی طرح اللہ کی کارگاہ مشیت کے ارکان بن جاتے ہیں اور ان کا کام گو خلقت کے کاروبار سے ہی وابستہ ہوتا ہے مگر یہ عام طور پر اپنے تئیں خلقت کی نظروں سے مخفی رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی جس پر چاہیں اپنے آپ کو ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق براہ راست اللہ کی مشیت اور اس کی پوشیدہ حکمتوں اور تدبیروں کے ساتھ ہوتا ہے' اس لئے ان کا مکاشفہ و مشاہدہ اور طے الارض کی مخصوص قوتیں بھی عطا کی جاتی ہیں۔ مگر یہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ نظر ان کی ہمیشہ اللہ کی مشیت پر رہتی ہے اور اسی کی مطابقت میں وہ دعا اور توجہ اور دیگر روحانی قوتوں سے امور تکوینی میں تصرف کرتے ہیں۔ ان کو غوث' قطب اور ابدال کہا جاتا ہے۔

www.yabahu.com

گو عوام کے نزدیک ان کی محیّر العقول صلاحیتوں اور خوارق عادت کاموں کی وجہ سے بڑی شان ہوتی ہے اور ان کی پر احترام ہیبت دلوں پر بیٹھی رہتی ہے مگر روحانیت میں کئی دوسرے اولیاء اللہ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ان کے قرب اور درجے کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان جیسی قوتیں نہیں رکھتے مگر اللہ کے ہاں ان کا رتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کچھ عرض کریں تو اللہ کی مشیت ان کی معروضات کا احکام میں بدل کر زمرہ ابدال کو ان کی تعمیل میں لگا دیتی ہے۔

حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معرفت جب زیادہ ہوتی ہے جو نہایت مقصود ہے تو تصرف کی ہمت کم ہو جاتی ہے "فصوص الحکم" کی فص لوطیہ میں ذکر ہے۔ کہ بعض ابدالوں نے شیخ عبدالرزاق سے کہا "آپ شیخ ابو مدین کو بعد سلام کے کہیں کہ اے ابو مدین! ہمارے لئے کوئی چیز دشوار نہیں ہوتی (یعنی ہم عالم میں تصرف کرتے ہیں اور آپ ایسا نہیں کرتے) اور حال یہ ہے کہ ہم آپ کے مقام کی رغبت رکھتے ہیں اور آپ ہمارے مقام کی رغبت نہیں رکھتے۔ واقعہ یوں ہے کہ ابو مدین رحمتہ اللہ علیہ ایسے مرتبہ پر فائز تھے جہاں ان کو ابدالوں کا مقام بھی حاصل تھا اور اس مقام کے سوا بھی تھا۔ یعنی وہ ابدالوں سے اونچے مقام پر متمکن تھے اور وہ عبدیت اور کمال معرفت و توحید کا مقام تھا۔

اسی طرح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ نے ابتدائے حال کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ وہ خضر (علیہ السلام) ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن مسجد میں انہیں ایک شخص ملا اور کہنے لگا تم خضر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اسی شہر میں ایک ایسا آدمی ہے جس کے دروازے پر خضر کئی بار گیا ہے لیکن اسے ملاقات کی اجازت نہیں ملی۔ یعنی وہ اپنے کام منصب اور درجہ کے لحاظ سے خضر سے بھی

بڑھ کر ہے۔

غرضیکہ اللہ والوں کے مقامات بہت بلند اور بے شمار ہیں اور ان میں پھر منصب کے لحاظ سے ان کا مقام بہت اعلیٰ ہے جو تعلیم اور رشد و ہدایت کے کاموں پر لگا دیئے جاتے ہیں وہ یا تو چل پھر کر یہ فریضہ سر انجام دیتے ہیں خواہ وہ لوگوں میں معروف ہوں یا نہیں اور یا پھر کسی جگہ مقام کر کے خلق خدا کو روحانیت کا فیض پہنچاتے ہیں۔ ہر طرف سے درویش اور فقراء روحانی تربیت' اخلاق کی تلقین اور معرفت کے حصول کے لئے ان کے پاس جمع ہوتے ہیں اور وہ اللہ کی طرف سے اس خدمت پر مامور رہتے ہیں۔ عام طور پر وہ زاویوں' خانقاہوں یا جماعت خانوں میں بیٹھ کر دروازے ہر ایک کے لئے کھول دیتے ہیں اور ہر شخص ان سے بقدر ظرف فیض پا سکتا ہے۔

زبان و بیان :۔

آخر میں ایک دو باتیں صوفیاء کی اصطلاحات اور ان کے ادارہ خانقاہ کے بارے میں لکھی جا رہی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس پر صوفیاء کو مطعون کیا ہے کہ انہوں نے مشکل اصطلاحات استعمال کر کے اپنی باتوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ چند فقہاء نے ابن عطاء سے پوچھا "صوفیاء میں یہ کیا معاملہ ہے کہ تم لوگوں نے عام زبان کو چھوڑ کر ایسی اصطلاحات وضع کر لی ہیں جو سننے والوں کو نامانوس معلوم ہوتی ہیں۔ دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو تم کچھ چھپانا چاہتے ہو اور چھپانا حق کے سلسلہ میں مفید نہیں ہوتا۔ پس ظاہر ہے کہ تمہارا عقیدہ بر حق نہیں ہے اور یا پھر تمہارے عقیدہ میں کچھ ایسی کمی ہے جس کا تم عام لوگوں میں اظہار نہیں کرنا چاہتے"۔

ابن عطاء نے جواب دیا: "ہم ایسا کرتے ہیں کیونکہ ہمارا عقیدہ و عمل ہمیں بہت عزیز ہے اور ہم نے پسند کیا کہ صوفیوں کے علاوہ اسے کوئی نہ جان سکے۔ لہٰذا

www.yabahu.com

ہم نے عام زبان استعمال نہیں کرنا چاہی۔ اور اس کے لئے خاص الفاظ وضع کر لئے"۔(۴۳)

دراصل بات یہ ہے کہ ہر شعبہ علم میں اس پر غور کرنے والوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے علم کے اظہار و ابلاغ کے لئے اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح کے مطابق زبان استعمال کریں۔ مثلاً" فلسفی مخصوص اصطلاحات و تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ سائنس دان اور ریاضی دان فارمولوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح شعرا و ادباء کی زبان الگ ہوتی ہے کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ کیونکہ جو باتیں وہ کہنا چاہتے ہیں ان کے لئے وہی زبان موزوں ہے اور ان کے مخاطبین اسے سمجھتے ہیں۔ یہی حال صوفیا کا ہے۔ وہ جب واعظانہ سطح سے بلند ہو کر کچھ کہنا چاہتے ہیں تو انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ ہر نکتہ معرفت سادہ زبان میں بیان کریں۔ سادہ زبان میں سادہ باتیں ہی کہی جا سکتی ہیں۔ جب گہرائی یا بلندی سے کوئی نکتہ بیان کرنا ہو تو ابہام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور کلام میں متشابہات بھی آ جاتے ہیں پھر یہ باتیں صرف "راسخون فی العلم" کے لئے ہوتی ہیں ہر ایک کے لئے ان کا جاننا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ اس کو خواہ اخفاء کا نام دیں یا صوفیاء کی مصلحت تصور کریں مگر حق یہ ہے کہ تصوف کے یہ نکات معرفت ہر ایک کے لئے نہیں ہوتے۔

چنانچہ صوفیاء نے اگر "اپنے نظریات اور تجربات و واردات کی تعبیر کے لئے مخصوص زبان اور مخصوص اصطلاحات وضع کیں" تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کے لئے یہی زبان موزوں تھی اور وہ لوگوں کی عقلوں کے مطابق بات کرتے ہوئے صرف اپنے حلقہ اہل نظر کو مخاطب کر رہے تھے۔ جس طرح فلسفہ اور سائنس اور ریاضی کے تمام مسائل و معاملات ہر ایک کے لئے نہیں ہوتے اسی طرح ضروری نہیں کہ تصوف کے تمام معارف اس طرح بیان کئے جائیں کہ ہر ملائے مکتبی انہیں سمجھ سکے۔

آج کل طبائع کچھ مناظرہ پسند ہو گئی ہیں یا احساس مشیخت تکبر کی حدوں کو چھونے لگا ہے۔ ورنہ سنجیدہ و متین اہل علم جب صوفیاء کے نکات میں کوئی بات عام روش سے ہٹ کر پاتے تھے تو اس کی تاویل کی کوشش کرتے تھے۔ تاویل سے مراد یہاں حقیقت تک رسائی ہے یعنی ان کے مقام و علم کی مطابقت میں ان کی شرح کرتے تھے۔ اور اس پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیتے تھے کہ اولاً" یہ بات کیوں اور کس طرح کہی گئی تھی اور اس سے کہنے والے کی اصل منشاء کیا تھی؟۔

خانقاہ :۔

صوفیاء کرام نے دیکھا کہ مسجد بنیادی طور پر عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ اگر ہر کام وہیں کیا جانے لگا۔ خواہ وہ رفاہ عامہ یا تعلیم و تدریس سے ہی متعلق کیوں نہ ہو تو ان کی اصل غرض و غایت پر اثر پڑے گا۔ اس لئے انہوں نے اپنے لئے اپنے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے الگ ادارے قائم کئے۔ یعنی اپنے فرائض کی ضروریات کے پیش نظر ایسی عمارتیں بنا کر بیٹھے جہاں مسجد بھی تھی۔ مدرسہ بھی تھا۔ لنگر خانہ بھی تھا۔ اور جہاں درویشوں کے ذکر کے لئے خلوت کا انتظام بھی تھا۔ ایسی جگہوں کو المغرب میں زاویہ کہا گیا اور مشرق میں خانقاہ کا نام دیا گیا۔

خانقاہ میں شیخ طریقہ یا پیر مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی روحانی یا انتظامی صلاحیت پر منحصر ہے کہ خانقاہ کی افادیت سلف کی روایت کے مطابق موجود ہے یا نہیں۔ آج کل گو پیری مریدی خاندانوں کی میراث بن کر رہ گئی ہے۔ مگر ان موجودہ خانقاہوں میں اب بھی مشائخ کا فیض کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ صرف یہ ہوا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان سے حسن ظن نہیں رہا۔ اور ان نام نہاد دینی حلقوں نے ان کے اس ظن کو پختہ کرنے میں مدد دی ہے۔ جو فی نفسہ تصوف کے ہی خلاف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خانقاہوں کی کسی تحریک کے ذریعہ سے اصولوں اور بندھے

www.yabahu.com

نکے قاعدوں کا پابند کر کے اصلاح نہیں کی جا سکتی ہے۔ یہ کام اہل باطن کا ہے اور تقاضائے وقت کے مطابق یہ از خود ٹھیک ہو جائے گا۔ اقبال کا یہ پر حکمت نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ جو انہوں نے اپنے ایک مکتوب الیہ کو لکھا تھا۔ کہتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اس سلسلے میں میں نے ریمارک کیا کہ جس قوم سے خواجہ سلیمان تونسوی، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی اور خواجہ فرید چاچڑاں شریف والے (رحمتہ اللہ علیہم) اب اس زمانے میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا"۔(۴۴)

خانقاہوں پر ایک اعتراض بڑی شدومد سے کیا گیا۔ کہ انہوں نے قوم کے اجتماعی مفادات میں کوئی معاونت نہیں کی۔ ایسے معترضین کے نکتہ نظر سے اجتماعی مفادات سے مراد ہمیشہ سیاسی مفادات ہوتے ہیں۔ اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کر سکتا۔ صوفیاء نے اپنے لئے ایک کام تجویز کیا اور وہ ہر زمانے کے لئے ایک تھا۔ وہ قوم کی ہدایت کی خاطر معلمی کا فریضہ تھا جسے انہوں نے دنیاوی لحاظ سے بغیر کسی اجر کی توقع کے سر انجام دیا۔ سیاست بہت اہم شعبہ سہی لیکن اس کے لئے بہت لوگ ہمیشہ موجود رہے۔ اور اس کی مثالیں موجود ہیں کہ صوفیاء نے بھی حسب استطاعت و توفیق ان کی معاونت کی۔ سیاسی جلوسوں کے ڈھول ڈھمکوں اور نعروں کے شور و شغب میں تو وہ شریک نہ ہوئے لیکن کام انہوں نے ضرور کیا۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک میں دیکھئے تو سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ علیہ ایک صاحب ارشاد صوفی تھے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صوفی تھے۔ تحریک پاکستان میں پیر السید یوسف الگیلانی پیر آف وانا (حفید سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ)، پیر جماعت علی شاہ (علی پور) اور حضرت سلطان غلام دستگیر القادری (خانوادہ حضرت سلطان باھو قدس سرہ) صوفی بزرگ تھے۔ جدید دور کے تقریباً تمام مشائخ نے پاکستان کی تحریک کی حمایت کی اور یہ اصحاب باطن ہی تھے جنہوں نے اللہ کی مشیت

کے تحت یہ فیصلہ کیا۔ کہ ہندوستان تقسیم ہو اور پاکستان بنایا جائے۔

اگر چاہیں تو تصوف میں عملی رجحان کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام سے مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صوفی قوم کی اجتماعی مساعی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے اور یہ بات تو ان کے حق میں تعریف بن جائے گی کہ اس کے باوجود وہ اپنے اصل کام یعنی تعلیم و تربیت سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ دیکھا جائے تو صرف صوفیائے کرام ہی ہیں جو آج بھی اسی اصول پر قائم ہیں جب کہ کئی دوسرے لوگ اپنے اصولوں پر نظرثانی کر کے سیاسی اقتدار کے طالب ہو گئے اور حکام کے حاشیہ نشین بن کر رہ گئے۔

حلقۂ پیر مُغانم ز ازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بُودیم و ہماں خواہد بُود

(میں ازل سے پیر مغان کا حلقہ بگوش ہوں۔ ہم وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اور یہ حال اسی طرح رہے گا)

اور۔

ہست محفل بر آں قرار کہ بُود
ہست مُطرب بداں ترانہ ہنُوز

(محفل اسی طرح قائم ہے جیسے کہ پہلے تھی اور گانے والا ابھی تک گیت گا رہا ہے)

----- ☆ ☆ ☆ -----

www.yabahu.com

تاریخ کا ظاہری عمل اور تصوف

پُر جوش تخلیقی عمل :-

تصوّف نظریہ نہیں بلکہ عمل ہے۔ تاریخ کے صرف ظاہری عمل کے اندر ہی اس کا جائزہ لیا جائے تو اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ صوفیاء تصوف کو محض ایک علمی معاملہ نہیں سمجھتے۔ وہ محض نظری دلچسپی کے لئے مرشد کی تلاش میں نکلتے ہیں نہ ہی وہ حقائق زندگی کو نظر انداز کر کے خود فراموشی اور بے خودی کی خاطر تصوف میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس تصوف کے عملی زندگی میں کچھ مثبت مقاصد ہیں جنہیں سالکین دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ ایک صوفی کی زندگی ان مقاصد کو پانے کے لئے عملی ریاضت کا ایک طویل سلسلہ بن جاتی ہے۔

صوفیاء کے تمام تذکروں میں بار بار یہ دعویٰ دہرایا جاتا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر عمل ہے' صرف ذہنی مشق نہیں ہے بلکہ یہ تو پوری شخصیت کا ایک پرجوش تخلیقی عمل ہے جس کا تعلق براہ راست فرد کی زندگی کے روحانی یا اخلاقی پہلو سے ہے' یہ ایک طرز حیات ہے' جسے وہی اپناتے ہیں جو سب سے پہلے اپنے اندر روحانی و اخلاقی تبدیلی لاتے ہیں۔ پھر وہ پورے جذبے کے ساتھ جو اللہ نے انہیں ودیعت کیا ہوتا ہے' تصوف کے طریق پر چلتے ہیں۔

فقیر کو ایک بزرگ صوفی کے الفاظ یاد آ رہے ہیں' جنہوں نے فرمایا تھا کہ علم کے دوسرے شعبوں میں تو پہلے علم حاصل کرتے ہیں اور پھر عمل کی نوبت آتی

ہے مگر تصوف میں پہلے عمل ہے اور پھر علم حاصل ہوتا ہے۔ یہی اصول عام طور پر مذہب میں کار فرما ملتا ہے۔

آثارِ قلم کی بجائے آثارِ قدم :-

ہر شخص جو تصوف کے متعلق بات کرتا ہے یا اس کے بارے میں لکھتا ہے۔ صوفی نہیں ہو جاتا۔ آپ ایسے کو دانشور کہہ سکتے ہیں یا چاہیں تو اسے ایک محقق یا ادیب کہہ لیں لیکن اگر وہ کسی طریقے کے سلوک پر عامل نہیں ہے تو اسے صوفی لقب نہیں دیا جا سکتا۔

رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

زادِ دانشمند' آثارِ قلم
زادِ صوفی چیست؟ آثارِ قدم

(عالم کا ذخیرہ مال اس کے قلم کے آثار ہیں یعنی وہ جو کچھ لکھتا ہے۔ صوفی کا سرمایہ کیا ہے؟ اس کے قدموں کے آثار جن کی رہنمائی میں دوسرے چلتے ہیں)۔(۴۵)

صوفی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قلم لے کر بیٹھ جائے اور کسی رسالے یا کتاب کی صورت میں اپنے روحانی تجربات اور وجدانی کیفیات قلمبند کرنے لگے۔ لیکن ایک صوفی ایسا کر بھی سکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیاء کرام اپنے پیچھے ان موضوعات پر بے شمار کتابیں چھوڑ گئے ہیں لیکن یہ ان کے عمل کا اصل دائرہ نہ تھا۔ صوفی مرد راہ ہوتا ہے' ایک مستقل اور باقاعدہ سالک جو چلتا رہتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے ایسے نقش قدم چھوڑ جاتا ہے جو اس کی موت کے بعد بھی آنے والی نسلوں کی روحانی منزل کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ صوفی سلوک کے اصول و قواعد کے مطابق اپنی روزانہ زندگی میں عمل پیرا ہو کر یہ کام سرانجام دیتا ہے۔ مولانا روم کے شعر میں یہ مفہوم موجود ہے کہ صوفی ہمیشہ عملی طور پر اپنی اور دوسروں کی

www.yabahu.com

اخلاقی و روحانی تربیت میں مشغول رہتا ہے۔

صوفیاء میں بے شک کئی معروف شعراء ہو گزرے ہیں اور بہت سے کامیاب مصنفین بھی تھے۔ مگر انہیں لکھنے کی تحریک ہمیشہ ظاہر سے نہیں باطن سے ملی۔ کوئی بھی مادی غرض ان کو رسالے' کتابیں یا شاعری کے دیوان لکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے سامنے صرف ایک مقصد ہوتا تھا کہ وہ ان مردان راہ کی رہنمائی کریں یا اپنا سوز دل ان کو منتقل کر دیں جو انہی کی طرح طریق پر گامزن تھے۔ اس کے پیچھے شہرت یا ریا کا جذبہ ہرگز نہ ہوتا تھا۔ پس ان کے لئے یہ آثار قلم نہ تھے بلکہ یہ بھی مستقبل کی طرف جانے والی شاہراہ پر ان کے نقش قدم ہی تھے۔ جن کے متعلق غالب نے کہا ہے:

نقش پئے رفتگان جادہ بُود در جہاں
ہر کہ رَوَد بایدش پاسِ قدم داشتن

(گذرے ہوئے لوگوں کے پیچھے ان کے نقوش قدم جہاں میں راستہ بن جاتے ہیں چنانچہ اب جو بھی چلے اسے چاہیے کہ ان قدموں کا لحاظ رکھے یعنی اسی راستے پر گامزن ہو۔)

شیخ بدر الدین رحمتہ اللہ علیہ جب حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے مناقب پر "سیر احمدی" لکھ رہے تھے۔ تو انہیں حضرت شیخ کے ایک اور خلیفہ شیخ نور محمد پٹنی رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کتاب پیش کی اور اس موقع پر وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔

"ذکر مقالات و تحریر واردات بکارے نمی آید۔ داخل لا یعنی است' دو رکعت صلوٰۃ بہ از تحریر مقالات"۔ (مقالات کا ذکر اور واردات کا لکھنا کسی کام نہیں آتا۔ یہ لا یعنی امور میں داخل ہے۔ مقالات لکھنے کی بجائے دو رکعت نماز کی ادائیگی بہتر ہے)۔(۴۶)

یہ کہنا اس بنا پر نہ تھا کہ انہوں نے ناپسندیدگی یا کم ذوقی کے سبب انہیں تنبیہہ کی۔ ان کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ لکھنا ختم کر دیں۔ وہ صرف مردان راہ کی عملی زندگی کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں پر زور دینا چاہتے تھے۔ جنہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

مُعلّم و مُربّی :۔

جب بھی معاشرے کے اندر صوفیاء کے کام پر بات ہوتی ہے تو صوفیاء کے کام کو اکثر کم حیثیت دکھایا جاتا ہے۔ عام طور پر تو ایک صوفی معاشرے میں معلم بن کر رہتا ہے' اپنے سلوک کی تربیت ختم کر کے وہ اپنے بیٹھنے کے لئے ایک جگہ منتخب کر لیتا ہے۔ لوگ اس کی خانقاہ یا زاویہ میں آتے ہیں اور وہ انہیں ان کے اخلاقی و روحانی و معاشرتی مسائل میں ہدایت دیتا ہے۔ تذکروں میں صوفیاء کی ایسی بہت سی مثالیں بھی مل جائیں گی جو ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں اور دور افتادہ جگہوں میں رہنے والوں کے اندر علم و دانش بانٹتے پھرتے ہیں۔ وہ دور دراز علاقوں میں پہنچتے ہیں اور لوگوں کو حکمت سکھاتے ہیں۔ ایک لحاظ سے صوفیاء مبلغ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اپنے عمل اور نمونے کے ذریعے دوسروں کی اصلاح کرتے ہیں۔ ان کی زندگی دوسروں کے لئے مثال بن جاتی ہے کہ لوگ صبر' تحمل' بے غرضی' خلوص' خیرات اور نیکی کے لئے محبت ان سے سیکھتے ہیں۔

مُعاشرے کے ضَمیر کی آواز :۔

ایک ولی معاشرے میں بلند اخلاقی کے لحاظ سے اقدار و معیار کا زندہ نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے امیر و غریب میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا وہ ان تمام کو جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں تعلیم دیتا ہے۔ لوگ اکثر ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں لیکن وہ دعا و برکت اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ ان کے

www.yabahu.com

دلوں میں سکون بحال کر دیتا ہے۔ معاشرے کے زخموں کو مندمل کرنے میں صوفیاء نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اس بناء پر عوام و حکام نے انہیں احترام کی نظر سے دیکھا۔ وہ اکثر اپنے ادوار میں ضمیر کی آواز بن کر رہے۔ جب بادشاہوں اور حاکموں کے سامنے کوئی بھی حق بات کہنے کی جرات نہ کرتا تھا۔ تو مستبد حکمرانوں کو ڈانٹنے اور پھٹکارنے کے لئے ان کی آواز محلوں اور درباروں میں گونجتی تھی۔

صُوفیاء پر ہی اِعتراض کیوں؟ :۔

فی الحال پیش نظر وہی عمل ہے جو ظاہر میں نظر آتا ہے اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مفاد میں ہوتا ہے۔ ایک فقیہ مسجد میں یا کسی مکان کے کونے میں بیٹھ جاتا ہے اور مذہبی معاملات کے بارے میں فتاویٰ رقم کرتا ہے' یا کتابیں لکھتا ہے۔ ایک مدرس کتابوں اور رسالوں کا درس دیتا ہے۔ ایک مبلغ دین کی تبلیغ کرتا ہے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ اصلاح کرتا ہے۔ ایک فلسفی ہر قسم کے مسائل کو اپنے فکر کی آماجگاہ بناتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اس کی زبان کو بھی نہیں سمجھتے۔ پھر ایک شاعر شعر کہتا ہے اور سناتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کرتا۔ کسی کو ان کے منصب پر اعتراض نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ان کے کام پر اعتراض کرتا ہے' حالانکہ یہ صوفیاء کے عمل سے ملتے جلتے کام ہیں لیکن خانقاہوں اور زاویوں میں صوفیاء کی نشست و طریق کار پر اعتراض کیا جاتا ہے' جب کہ ماضی میں یہ جگہیں ایک لحاظ سے معاشرتی سرگرمیوں کے مراکز رہی ہیں۔ مسجدوں کے بعد دوسرا درجہ انہی کا تھا' جہاں علم و معرفت کے طالب جمع ہوتے اور اپنا مطلوب و مقصود پاتے تھے۔ خانقاہ یا زاویہ ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں لوگ عبادت و اذکار اور تلاوت وغیرہ کے لئے ٹھہرتے تھے۔ مزید برآں یہاں مسافروں اور درویشوں کو طعام ملتا تھا اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس صدی کے نصف اول کے متکلمین اور جدید

تعلیم یافتہ لوگوں نے تصوف کو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ اور سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان معترضین کی تھی جو محض روشن دماغی اور خرد پسندی کے زعم میں تصوف کے مخالف ہوئے۔ ان بے چاروں نے صوفیاء کی کتب پڑھیں اور نہ صوفیاء کی مجلس میں بیٹھے صرف خود کو چالاک اور دانشور ظاہر کرنے کے لئے سنی سنائی کی بناء پر تصوف کے خلاف باتیں کرتے رہے۔

تاریخی شہادت :۔

جن لوگوں نے صوفیاء کی تاریخ کا صحیح نظر سے مطالعہ کیا ہے' جانتے ہیں کہ صوفیاء نے اپنے آپ کو عام مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے کبھی علیحدہ نہیں رکھا۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "قرون وسطیٰ کے مسلمان صوفیاء نے معاشرتی زندگی کو بہت اہمیت دی۔ وہ تنہا خود مکتفی سوچ بچار کو بلند ترین صوفیانہ معیار کے برابر نہ جانتے تھے کیونکہ اس طرح آدمی خود مرکزیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں محدود ہو جاتی ہیں اور وہ معاشرتی زندگی کی قوت بخش رو سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے خانقاہیں اور جماعت خانے تعمیر کئے جہاں مختلف طبائع اور طرح طریقوں کے لوگ مل کر بیٹھتے اور رہنا سیکھتے تھے"۔(۴۷)

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء اپنے اردگرد برادران قوم کے دکھ سکھ کو محسوس کرنے میں ہمیشہ نہایت ہوشیار رہے۔ اگرچہ انہوں نے خانقاہوں میں اپنے آپ کو عبادات و مناسک کی ادائیگی اور اوراد و اذکار کے کام میں لگائے رکھا۔ لیکن انہوں نے ان واقعات پر ہر آن نظر رکھی جو قوم کو پیش آ رہے تھے۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ صوفیاء نے کسی دور میں بھی ان معاشرتی' سیاسی اور قومی مسائل سے بے اعتنائی نہیں برتی جو عملی مقاصد کے لئے توجہ کے مستحق تھے۔

www.yabahu.com

بعض اوقات کم علمی یا بے خیالی میں کہہ دیا جاتا ہے کہ صوفیاء افراد قوم کو معاشرہ ترک کرنے اور علیحدگی اختیار کرنے کے لئے کہتے رہے اور خود اپنا وقت زیادہ تر شہروں اور قصبوں سے دور صحراؤں اور پہاڑوں کی غاروں میں رہ کر گزارتے رہے۔ اس کے متعلق اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ صوفیاء کا اپنا ایک تربیتی نصاب ہے۔ ذکر و فکر ان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ اولیاء و انبیاء خود تربیتی کے لئے کچھ وقت خلوت میں گزارنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ فلسفی اور دیگر شعبہ ہائے علم کے لوگ بھی کچھ مدت کے لئے کسی خلل کے بغیر غور و فکر کرنے کے لئے تنہائی ضروری خیال کرتے ہیں۔ البتہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے سری سلوک کے لوگوں کا معاملہ جدا ہے۔ ان کے خلاف اس اعتراض کی کافی گنجائش موجود ہے۔ دنیا بھر میں مذہبی و غیر مذہبی سری سلوک کے سالکین کی مثالیں موجود ہیں۔ جو عام انسانیت سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنا وقت ہمیشہ کے لئے تنہائی میں صرف کرتے ہیں لیکن صوفیاء نے کبھی ان کی پیروی نہیں کی۔ وہ کچھ وقت عبادت اور تصفیۂ قلب اور تجلیۂ رُوح کے لئے ضرور تنہائی میں بسر کرتے ہیں لیکن یہ علیحدگی و خلوت عارضی ہوتی ہے پھر وہ گوشہ خلوت سے نکل آتے ہیں اور اپنے لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی اخلاقی و روحانی ترقی کے لئے شب و روز کام کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شاید کچھ صوفیوں کی مثالیں ایسی بھی مل جائیں جو ہمیشہ بالکل مخلوق سے الگ تھلگ رہے مگر ایک تو وہ بہت شاذ ہیں اور دوسرے ایسے صُوفیاء کبھی قابلِ تقلید نہیں سمجھے گئے۔ مشائخ طریقت اور ان کے زاویے' رباط' جماعت خانے اور خانقاہیں متفرق مذہبی' معاشرتی اور روحانی مساعی کا مرکز رہیں۔ اکثر صورتوں میں انہوں نے بعض ممالک میں سیاسی تحریکیں بھی چلائیں اور جہاد بھی کیا۔

امن اور جنگ میں صوفیاء اپنی قوم کے ساتھ رہے۔ وہ قومی واقعات اور قومی

بحرانوں میں اس طرح شامل رہے کہ انہوں نے اپنا رویہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اختیار کیا۔ بادشاہ ان سے مشورے لیتے تھے اور بعض اوقات اہم مواقع پر سفارت کے کام بھی انہیں تفویض کرتے تھے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ الاکبر ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ دونوں نے اپنے حکمرانوں کے لئے سفارت کے وفود کی قیادت کی۔ صوفیاء کرام کا تو یہ حال تھا کہ لوگ چین کے ساتھ رہتے تھے تو وہ بھی مطمئن ہوتے تھے اور جب لوگ جنگ یا بد امنی کے دور میں مصیبت میں مبتلا ہوتے تھے تو وہ بھی پریشان نظر آتے تھے۔ اکثر انہوں نے غیر معمولی جرات اور ایثار کا مظاہر کرتے ہوئے اپنے عوام کے حوصلے بلند رکھے۔

جب چنگیز خان کی فوجیں اسلامی ممالک کے شہروں اور قصبوں کو تاخت و تاراج کر رہی تھیں تو اس کے لشکری حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ میں بھی جا پہنچے۔ اگرچہ یہ لوگ مذہب سے بالکل بے گانہ تھے مگر شیخ سے کچھ عقیدت محسوس کرتے تھے۔ شیخ سے درخواست کرتے ہوئے ایک پیغام بھیجا گیا کہ وہ شہر سے باہر چلے جائیں مگر شیخ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایک مسلمان قائد اپنے پیروؤں کے پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ انہیں اپنے ایک ہزار مریدوں کے ساتھ جانے کی اجازت دی گئی بلکہ مغلوں نے اپنی حفاظت میں انہیں سرحد تک پہنچانے کی پیشکش بھی کی۔ لیکن شیخ نے عامتہ المسلمین کو قتل کے لئے پیچھے چھوڑ جانے کے بدلے میں یہ پیشکش قبول نہ کی۔ آخر کار شیخ نے تلوار ہاتھ میں لے کر لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے جہانگیر کے ظالمانہ احکام کے خلاف جو جرات مندانہ صدا بلند کی اور جن سختیوں سے گزرے۔ انہیں تو ہر ایک جانتا ہے۔ انہوں نے دربار میں سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ قید ہوئے' ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی لیکن وہ بادشاہ کے خلاف شریعت قانون کی تعمیل پر آمادہ نہ

www.yabahu.com

ہوئے۔ شیخ کا یہ اقدام اپنے دور کے لوگوں کے لئے مثال قائم کرنے کے لئے کافی تھا۔ تاکہ وہ خلاف شریعت کاموں کے خلاف سدِ سکندر تھام میں ثابت قدم رہیں۔

دور حاضر میں سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے خانوادہ سے پیر السید یوسف محمود فیض اللہ الگیلانی بغدادی المعروف پیر آف وانا (۱۹۰۵ء ۔ ۱۹۷۶ء) اور حضرت سلطان باہو قدس سرہ کی اولاد سے سلطان العصر حضرت غلام محی الدین القادری (۱۹۱۹ء ۔ ۱۹۸۶ء) رحمتہ اللہ علیہما نے تحریک پاکستان اور جہاد و کشمیر (۴۹ ۔ ۱۹۴۷ء) میں اپنے ہزار ہا مریدین کے ساتھ عملاً شرکت کی۔ قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خان اور دیگر مقتدر شخصیات سے بھی ان کے باہمی سلسلہ روابط رہے۔ اول الذکر کو صدر آزاد کشمیر نے "غازی کشمیر، لیفٹیننٹ کرنل" اور آخرالذکر کو "فخرِ کشمیر" کے اعزاز پیش کئے۔ ہر دو صاحبانِ طریقت تاحیات سلسلۂ عالیہ قادریہ کی تبلیغ و ترویج میں بھی مصروف رہے اور ہمیشہ پاکستان کے استحکام اور بقا کے لئے سرگرم عمل رہے۔ نیز انہوں نے اپنے مریدین کی اخلاقی، سماجی اور معاشرتی اصلاح بھی کی۔

صوفیاء ہمیشہ معلّم، مبلغ اور مرشد بن کر آزادیِ فکر اور روشن خیالی کے مشعل بردار رہے۔ ظاہر ہے یہ کام تنہائی میں تو سرانجام نہیں دیئے جا سکتے تھے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کا صحیح مطالعہ کریں۔ اور صوفیاء کے بارے میں اس قسم کے لغو اعتراضات کو اپنے ذہنوں سے دور کریں جس طرح ہر شخص بیک وقت ایک سپاہی، سیاست دان، طبیب، معمار، یا فلسفی نہیں بن سکتا، اسی طرح ایک صوفی بھی ایک اکیلے سارے کام نہیں کر سکتا۔ البتہ صوفیاء میں ان پیشوں اور عہدوں کے لوگ ہمیشہ ضرور رہے ہیں۔ لیکن بات وہی ہے کہ صوفی کا اپنی تربیت علمی و روحانی کے لحاظ سے معاشرے میں ایک خاص کام متعین ہے۔

قوم کو صوفیاء کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ انہوں نے اسلامی معاشرے میں معاشرتی و اخلاقی اور روحانی ترقی کے لئے ماضی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں

اور آج بھی بلاشبہ وہ اپنی علمی و روحانی صلاحیتوں کے اعتبار سے اہم قومی خدمات کی اہلیت رکھتے ہیں۔

------ ☆☆☆ ------

حواشی

۱۔ The Foreseeable Future, By Sir George Thomson p, 157-8

۲۔ What is Sufism - By, Martin Lings p. 127,

۳۔ نفحات۔ از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ پروفیسر محمد سرور۔ ص ۳۹ تا ۴۲

۴۔ جدیدیت۔ از محمد حسن عسکری۔ ص ۱۱۳ ۔ ۱۱۲

۵۔ نفسیات و واردات روحانی۔ از ولیم جیمز۔ ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ ص ۵۵۹ تا ۵۶۳

۶۔ Mysticism By, F. C Happold, p. 45 - 50.

۷۔ Iqbals Philosophy of Religion, By, Mohammad Maruf, p. 136 - 53

۸۔ The Mystical Philosophy of Ibn-Arbi, By A.E. Affifi, p.106-9

۹۔ Mysticism and Logic By, Bertrand Russel, p.8-11

۱۰۔ تاریخ تصوف۔ از یوسف سلیم چشتی۔ ص ۱۰ تا ۱۱

۱۱۔ شرح و موازنہ کے لئے دیکھئے: صفحات ص ۲۵

۱۲۔ Types of Philosophy, By, William Ernest Hocking, p 256-7

۱۳۔ مولانا ابوالحسن ندوی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے "یہ مادہ پرستانہ روح یورپ کے تمام سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی قدیم و جدید نظامات میں جاری و ساری نظر آئے گی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک کی، جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، روح بھی مادیت ہے"۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ ص ۲۸۵)

www.yabahu.com

۱۴۔ خواجہ عبدالحلیم انصاری کا چند سال پہلے لاہور میں انتقال ہوا۔ دہلی کے رہنے والے تھے پہلے نقشبندیہ طریق کے مطابق سلوک طے کیا' پھر ایک مجذوب نے دستگیری کی اور معرفت کی راہیں ان پر کھلیں۔ شیخ کی حیثیت سے توحید کی تلقین کرتے تھے اور حضرت مجدد صاحب کی طرح وحدۃ الوجود کو محض ایک مقام مانتے تھے۔ اپنے طریقہ کو "طریقہ توحیدیہ" کہتے تھے۔ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ بعض کتب کے نام یہ ہیں۔ تعمیر ملت' حقیقت وحدۃ الوجود' چراغ راہ وغیرہ۔

۱۵۔ احوال العارفین۔ مرتبہ: حافظ غلام فرید۔ ص ۱۵۰

۱۶۔ تاریخ تصوف۔ از پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ ص ۱

۱۷۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے اپنی تالیف "شرح اسمائے حسنیٰ" کے چوتھے باب میں دیگر مذاہب کے پیروؤں میں جا بجا مروج اسم معبود کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی میں تو شرک کا شائبہ ہے جیسے یزداں ۔معنی خالق خیر جس میں دو خالقوں کے وجود کا عقیدہ پنہاں ہے اور اکثر اسماء کو صفاتی نام کہا جا سکتا ہے جیسے خدا ۔معنی خود آئندہ یا خود بخود ظہور کرنے والا یا واگورو ۔معنی عجیب اوستاد یا بے انت ۔معنی ابد وغیرہ اور بعض تو ایسے ہیں کہ انہیں صفت الٰہی بھی نہیں کہہ سکتے جیسے نرائن ۔معنی پانی پر سونے والا۔ ان امثلہ سے ظاہر ہے کہ ان ناموں کا ذکر کرنے والے علم و معرفت کے اس درجے تک کہاں پہنچ سکتے ہیں جہاں اسم اعظم "اللہ" متمکن ہے۔

18.- The Religious Attitude and life in Islam, p. 215.

19.- The Tawasin, Introduction. Sufism today,

By: Muqaddam Abdul Qadir Sufi

20.- Ideals and realities of Islam By. Syed Hussain Nasr, p. 122.

۲۱۔ عقل بیدار۔ از حضرت سلطان باہو۔ ص ۳۶

۲۲۔ جواہر الاسرار در شرح مثنوی مولانا رُوم۔ از حسین بن حسن سبزواری۔ ص ۵۹ تا ۶۲

۲۳۔ یہاں ہر طریقے کے نصاب سلوک کی تفصیل نہیں دی گئی صرف اشارہ مقصود تھا۔ تفصیل علمی لحاظ سے متعلقہ طرق کے بزرگوں کی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے اور عملی تعلیم تو اس طریقے کے مرشد سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۲۴۔ حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ۔ از مولوی محمد حسن نقشبندی مجددی۔ ص ۴۰۸

۲۵۔ مکتوبات۔ حصہ ہشتم دفتر سوم' مکتوب بیست و ششم۔

۲۶۔ سلوکِ محمدی۔ از میاں محمد ظہور الدین احمد۔ ص ۳۴۴

۲۷۔ مکتوبات۔ میر سید علی ہمدانی۔ ص ۲۳

۲۸۔ عوارف المعارف۔ ترجمہ: سید ارشد احمد ارشد۔ ص ۵۲۲

۲۹۔ "تزکیۂ نفس" کے مصنف لکھتے ہیں "ہمارے نزدیک اس (خدا کی معرفت) سے خدا کے متعلق صرف ان باتوں کا جاننا ہے جن کو انسان جان سکتا ہے اور جن کو جان لینے کے بعد اس کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ معرفت الٰہی سے متعلق جس حد تک اس کے حیطہ ادراک میں ہے' وہ یہی ہے" اگر اس سے صرف عقل جزوی یا استدلالی کا مطمئن ہونا مراد ہے۔ تو صوفیاء کا موقف یہ ہے کہ یہ بیان ناقابل اعتبار اور عارضی ہے انسان کی پوری فطرت مطمئن ہونی چاہیے۔ اور یہ صرف اس بصیرت سے ممکن ہے جس کے ذریعہ حاصل کردہ علم مشاہدہ و معرفت کہلاتا ہے۔

۳۰۔ قرآن مجید: ۳ ۔ ۲۱

۳۱۔ کلام سُلطان باہُو۔ خُو: تعارف۔ از اکبر نذیر احمد۔

۳۲۔ یہ بات بھی ہو ایک مسنون انکار سے ملتی ہے تا کہ یہی ہے کہ "صوفیا کے ہاں اطاعت شیخ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ عملاً اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت محض ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے"۔ ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۸۲ء

۳۳۔ تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی۔ مرتبہ: سید ابو الحسن ندوی۔ ص ۱۳۵

۳۴۔ ان کے حالات فقیر نے کتاب "تذکرہ غوث و قطب" میں لکھے ہیں۔

www.yabahu.com

۳۵۔ The Introduction of Sufi Doctrine By. Titus Burckhardt,p. 16.

۳۶۔Islamic Sufism By. S. Iqbal Ali Shah p.183.

۳۷۔ The Mystical Philosophy of Ibnul Arabi By. A.E. Affifi.

p.142

۳۸۔ اعتراضات امین احسن اصلاحی: تزکیہ نفس۔ ص ۵۹

۳۹۔ ملفوظات مہریہ۔ از سید پیر مہر علی شاہ۔ ص ۱۳

۴۰۔ رموز عشق۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ص ۱۰۹

۴۱۔ دین کا قرآنی تصور۔ از صدرالدین اصلاحی۔ ص ۶۱ ۔ ۱۴۲

۴۲۔ تلاش حق۔ از امام غزالی' ترجمہ: خالد حسن قادری۔ ص ۵۷

۴۳۔ Muslim Saints and mystics By. A.I. Arberry. p. 237-8

۴۴۔ اقبالنامہ۔ ص ۳۸۱۔

۴۵۔ کچھ شارحین نے دوسرے مصرع میں "آثارِ قِدَم" پڑھا ہے۔ اس صُورت میں مطلب یہ ہو گا کہ صُوفی کا سرمایہ نُورِ ازَل ہے۔

۴۶۔ حضرت القدس از شیخ بدرالدین۔ ص ۳۱۴

۴۷۔ The life and times of Sh. Faridud-Din Ganj Shakar,

By. Khaliq Ahmad Nizami p. 39

○ ○ ○

www.yabahu.com